مضامینِ اسلم

پبلشرز

ملک دین محمد اینڈ سنز بک سیلرز بل روڈ لاہور

باہتمام عبد الحمید خاں پرنٹر فیروز پرنٹنگ ورکس ۱۱۹ سرکلر روڈ لاہور سے طبع کرا کر
ملک دین محمد نے بل روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرستِ مضامین

فہرست مضامین

اردو ہندی

مضامینِ اسلم

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ آج ہندوستان میں جناب ایم۔ اسلم صاحب کے پلے کا دوسرا مزاحہ نگار نہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آپ ایک دلخراش بات بھی ایسے دلکش اور لطیف انداز سے کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والے پر گراں نہیں گذرتی۔ اس پر آپ کا طرزِ بیان اتنا سلیس اور دلکش ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی آپ کی تحریر سے لطف حاصل کر سکتا ہے۔ آج ہم آپ کے اکیس (۲۱) مضامین کا مجموعہ **مضامین اسلم** کے نام سے شائقین ادب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ جس طرح دنیا یہ تسلیم کر چکی ہے کہ اردو زبان میں مرزا حاجی کے پلے کی دوسری مزاحیہ کتاب اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی اسی طرح ہمارا دعوےٰ ہے کہ **مضامین اسلم** بھی ہر طبقے اور ہر خیال کے آدمیوں میں مقبول ہو گئے۔ ان اکیس (۲۱) مضامین میں سے اٹھارہ مضامین میں جناب مصنّف نے قوم اور ملک کے اخلاق۔ سیاسیات اور تہذیب پر اتنے دلکش اور لطیف پیرایہ میں بحث کی ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔

یہ مضامین محض ہنسنے ہنسانے کے لئے نہیں لکھے گئے۔ بلکہ آپ دیکھیں گے

کہ ہر مضمون ایک خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر ضبط تحریر میں لایا گیا ہے بعض مضامین میں بہت سے اہم قومی مسائل پر کچھ اس انداز سے خامہ فرسائی کی گئی ہے کہ پڑھنے والا مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اسکے ساتھ اسے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مصنف کے دل میں مذہب۔ قوم اور وطن کا کس قدر احترام ہے اور اس نے کس قدر عمیق نگاہ سے ان مسائل پر غور کیا ہے۔ تحریر کی دلکشی کے اندر آپ ایک سوز مضمر پائینگے۔ اور یہی جناب ایم۔ اسلم کا سب سے بڑا کمال ہے کہ گو اُن کی تحریر دکھے ہوئے دلوں پر نمک پاشی تو کرتی ہے۔ لیکن اس نمک پاشی سے بھی مجروح کو ایک سرور اور لطف حاصل ہوتا ہے۔

اس مجموعہ کے آخری تین مضمون "ہندی اردو کے قضیئے" کے عنوان سے ہیں اور آج یاران وطن اردو کے خلاف جو شاطرانہ چالیں چل رہے ہیں۔ جناب ایم۔ اسلم نے ان چالوں کو کچھ اس انداز سے بے نقاب کیا ہے۔ کہ ہندی کے بہی خواہوں میں کسی کو ان کا جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

آپ کے نیاز مند

(حاجی) ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز بل روڈ لاہور۔

میں تو ایک مزاح نگار ہوں

بنام

جناب مولوی شاہد احمد صاحب بی۔اے دہلوی

میں تو ایک مزاح نگار ہوں

میں تو ایک مزاح نگار ہوں لیکن فی الحال ہندوستانی وقار قائم رکھنے کیلئے "میں" سے بقلم خود "ہم" بن رہا ہوں۔ لہٰذا گو ہم نے ہزار منتیں مانیں بڑی بڑی درگاہوں پر حاضر ہو کر قوالیاں سنیں کہ کسی طرح یہ راز کسی پر نہ کھلے لیکن افسوس کہ ع۔ کوئی امید بر نہیں آتی

والا مضمون ہو کر رہ گئے ہیں۔

اب اگر مزاح نگاری اور وہ بھی خالص ہماری فنون لطیفہ میں شامل ہے تو پھر کافر ہی ہو جسے ہمیں بھی ایک لطیفہ ماننے یا تصور کرنے میں کچھ شک ہو تو۔ بڑی شان و شوکت والے بزرگ لوگ تو شاید اس نقطۂ نظر سے مزاح نگاری کرتے ہیں کہ ان کے "افکار عالیہ" پڑھنے والوں کا مغز جان تک معطر ہو جائے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس ظالم خوشبو سے ان پر سکتہ کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور جب ہوش میں آتے ہیں۔ تو حیران ہو ہو کر کہتے ہیں کہ ع۔

یہ وہ مضموں ہے جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

لیکن ہم ہندو مسلم اتحاد کی قسم کھا کر کہتے ہیں جو ہم نے کبھی اِس طفلانہ خیال سے اپنے شبدیز قلم کو مہمیز لگائی ہو۔ ارے معاذ اللہ یہ کس بحث میں ہم جا پڑے آپ مانیں یا نہ مانیں سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ لیکن ہم اپنے منہ سے میاں مٹھو بنے جا ئینگے۔ اِس لئے آج سے ہم نے بھی اپنے قلم سے اور اپنے ہاتھ سے اپنے "اسم" کے ساتھ۔ اب یہ اسم معرفہ ہے یا نکرہ یہ آپ جانئے مزاح نگار لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور پھر "اسم" بھی وہ جس کے ساتھ کوئی مہربان تو "مسٹر" اور کوئی بھلامانس "جرنلسٹ" اور کوئی پاگل "مولینا" لگا دیتا ہے اور اکثر قدر دان جوشِ وحشت نہ تو یا جوشِ عقیدت سے "لاہوری" بھی لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یعنی سو سو طرح سے دل کے پھپھولے پھوڑے جاتے ہیں۔ لیکن ہم نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ اعلان کر دینا چاہتے ہیں۔ کہ ہم دل سے جو آج کل خالص ہمارا ہی دل ہے۔ اپنے آپ کو ہرگز مزاح نگار نہیں سمجھتے ہاں! ع

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!

آپ جانئے! یہ مزاح نگاری بھی ایک قسم کا مرض ہے اور خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اب یہ وبائی صورت اختیار کرنے لگا ہے اور چشم بد دور وہ دن بھی

کچھ دور نہیں جب ہماری مزاح نگاری کی دنیا میں اس طرح پکار پڑے گی جیسے کبھی ہندوستان میں انفلوئنزا یا "طاعون شریف" کا چرچا ہوا تھا۔ "طاعون شریف" ہم نے اس لئے کہا کہ چونکہ (ذرا لگے ہاتھوں اس "کہ چونکہ" کی بھی داد دیتے جائیے) وبا سے مرنے والے "اوندھے منہ" بہشت میں گرینگے۔ اس لئے جو چیز جنت میں لے جانے یا پہنچانے کی محرک ہو اس کا احترام ایک مزاح نگار پر لازمی ہے۔ تو آمدم برسر مطلب! رات تو رہی ایک طرف اب تو ہمیں دن دہاڑے اپنے مزاح نگار ہونے کے اس طرح خواب آنے لگے ہیں۔ جیسے شریمتی کانگرس دیوی کو ہندو راج کے سپنے آرہے ہیں۔ اور ہم "آفتاب شہرت" بننے کے لئے کچھ اس طرح تلملا رہے ہیں۔ جیسے کانگرس بائی مسلمانوں کے وصال کے لئے تڑپ رہی ہے اور آج کل تو یہ کیفیت ہو رہی ہے کہ صبح صبح کوئی پونے سات بجے ہی انگریزی طرز کی نماز پڑھ لینے کے بعد ہم دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر یہ دعا مانگا کرتے ہیں کہ:۔

"اے ہندو کے رام اور مسلمان کے رب! ہماری گھریلو مزاح نگاری کا ڈنکا ملک کے کونے کونے میں اس طرح بجوا دے۔ جیسے ہندو مسلم اتفاق کی جڑ کاٹنے والے ہندی

ہندوستانی دھرماتماؤں کی کوشش سے آج کل
ہندی کے نقارے پر چوٹ پڑ رہی ہے اور اردو کی آواز
جو صدائے نفیری ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے صورِ اسرافیل
کی قوت عطا کرے"۔

آپ بھی جلدی سے "ثمہ آمین" کہہ دیجئے!

آپ جانیئے! کہ چونکہ ؎
اس دور میں سب مٹ جائینگے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

قائم رہیں گے اور کالمسٹ بابائی کی مسودہ قرار دیوں سے ہوئے بھٹے سماعوں کو
کو منغض کرتے رہینگے۔ نواہ اس جرم کی پاداشس ہیں ہمارے حافظ عالمگیر صاحب
ہمارے مضامین کو کتنا ہی مسخ کر کے شائع کیوں نہ کریں۔ ہم اپنی روش سے باز
نہیں آئینگے۔ اس لئے اگر کہیں سے ہمیں دعوتی رقعہ آجائے تو سب سے پہلے
سرنامہ دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اسمِ گرامی کے ساتھ "مشہور مزاح نگار" نہ

لکھا ہو تو "یہ ہمارا نہیں" کہہ کر واپس کر دیتے ہیں۔ گو اس روز گھر پہ کھانا کھانے کا لطف مطلق نہیں آتا۔

اسی طرح اگر کہیں ہمیں مشاعرہ پر بلایا جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ہمارے نام کے ساتھ علاوہ شاعر "نعم البدل" نہ تو بے بدل کے مشہور مزاح نگار بھی لکھا ہے یا نہیں اور جو نہ لکھا ہو تو سیکرٹری سے مل کر خود لکھوا دیا کرتے ہیں اور اگر بزم مشاعرہ میں ہمارا تعارف کرواتے ہوئے صاحب صدر ہمیں مزاح نگار ہونے کی لفظی سند عطا کرنی بھول جائیں تو ہم خود کہہ دیا کرتے ہیں کہ اے جناب! یہ الٹی گنگا بہانی کوئی ہمارے محترم صدر صاحب سے سیکھے۔ یہاں تو مزاح نویسی کرتے کرتے انگلیاں گھس گئیں اور آپ ہمیں صرف شاعر ہی سمجھے بیٹھے ہیں لیکن ان مدیر حضرات سے جو اپنے رسالہ کی عالمگیری پر اتراتے ہوئے چنگے بھلے انسان سے بیٹھے بیٹھے سوڈے کی بوتل بن جاتے ہیں اور ایک وقت میں دو پرچوں کے کے مالک اور مدیر بنکر دو آتشہ ہو جاتے ہیں بس اللہ میاں ہی سمجھے جانے! ان لوگوں کو ہم سے کیا ضد ہے جو ہماری مزاح نگاری کے یہ کبھی قائل ہوتے ہی نہیں اور جو آج نہیں ہوئے تو انشا اللہ! اب قیامت تک بھی نہ ہوں گے اور خدا کرے کہ روز حساب کے بعد اصل ٹھکانے پہنچکر بھی نہ ہوں۔ آمین! آپ بھی کہہ لیجئے۔

اور یہ نکتہ ہم نے کانگرسی لیڈروں سے جب وہ لاہور آئے تھے سیکھا تھا۔ کہ ہمارا ملک میں جیت اسی کی ہے جو اپنا پروپگنڈا آپ کرے۔ اس لئے عرض کرتے ہیں کہ ؎

مجھ سا انسان نہیں زمانے میں — پُر ہیں میرے مزاح سے اوقات
یہ کمالِ مزاح ہے میرا — غیر جلتے ہیں سن کے میری بات
کوئی دیکھے مرا کمالِ فن! — دن کو کہتا ہوں برملا میں رات

اور زبان کے شعر ہیں ؎

میرا ہر حرف حرفِ گیرِ ادب — ہیں لٹکتے ہوئے جیسے قطرات

لیکن افسوس! ؎

اِک زمانہ مزاح سے ہے نفور — ہیں یہ میرے مزاح کے برکات
داد دیتا نہیں کوئی مجھکو
قدر ہوتی نہیں مری ہیہات!

لیجئے! یہ تو رہا ہماری ادبی شاعری کا نمونہ اب ذرا ہماری مزاحیہ شاعری کا لطف بھی لے لیجئے عرض کیا ہے۔

کہا امرت سر چلو　　کہا امرت سر چلیں
کہا کرپان کا ڈر ہے　　کہا کرپان تو ہو گی

کہا کچھ عقل کی کہئیے　　کہا اب عقل کی کہدیں
کہا لقمان[۱] کا ڈر ہے　　کہا لقمان تو ہو گا

ہاں گھبرائیے نہیں یہ مزاحیہ شاعری ہے اس میں ردیف کی قید نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے آپ مانیں یا نہ مانیں ہم اسے جائز سمجھتے ہیں تو عرض کیا ہے

کرو کچھ قوم کی خدمت　　کریں کچھ قوم کی خدمت
کہا احسان[۲] کا ڈر ہے　　کہا احسان تو ہو گا

۱:۔ لاہور کے احراری ڈاکٹر جنہوں نے اخبارات میں اعلان کروایا تھا کہ اُن کے نام کے ساتھ لقمان ضرور لکھا جائے۔ کیوں نہ ہو احراری جو ٹھہرے۔

۲:۔ احسان بن دانش نہیں۔

حالات حاضرہ سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ ؎

کہا ہندو سے مل جاؤ کہا ہندو سے مل جائیں
کہا شیطان کا ڈر ہے کہا شیطان تو ہو گا

کہا سیفوؔ سے مل جاؤ کہا سیفو سے مل جائیں
کہا اعلان کا ڈر ہے کہا اعلان تو ہو گا

کہا نہرو سے مل جاؤ کہا نہرو سے مل جائیں
کہا نقصان کا ڈر ہے کہا نقصان تو ہو گا

کہا جھٹکے کو رکوا دو کہا جھٹکے کو رکوا دیں
کہا دیواںؔ کا ڈر ہے کہا دیوان تو ہو گا

۱:۔ حضرت سیف الدین کچلو کو ایک صاحب "جوش" میں آکر کچلوالدین سیفو فرما رہے تھے۔ اس لیے نقل کفر کفر نباشد؛

۲:۔ جھٹکہ دیوان۔

شعر تو خیر اور بھی سو پچاس ہو سکتے تھے۔ لیکن ہمیں اپنی علمیت کا جھنڈا لہرانے کی رسم تو ادا کرنی نہیں اس لئے اتنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں ہاں! آپ مفت میں "تذکیر و تانیث کی بحث میں نہ الجھیں۔" "ہو گی" اپنی جگہ درست اور "ہو گا" اپنی جگہ ٹھیک۔ اور پھر دنیا کا کاروبار بھی تو مؤنث اور مذکر کے ملاپ سے چل رہا ہے۔ اور اسی "ملاپ" کی بدولت ہندو مسلمان میں چل رہی ہے۔ لے ہے نام رام جی مہاراج کا۔

تو حاصل مصدر نہ تو یہ! حاصل مطلب یہ ہے کہ ہم آج کل "سٹینڈرڈ مزاح نگار" بن گئے ہیں۔ اور جدید ہندوستانی میں سٹینڈرڈ مزاح نگار اُسے کہتے ہیں جس کی تحریر پڑھ کر ہنسنا تو رہا درکنار پڑھنے والے کو "کھجلی" تک نہ ہو۔ اور قسم لے لیجئے جو اپنے نوشتے پر کبھی ہمیں خود بھی ہنسی آئی ہو۔ لیکن ہیں آپ بھی سچے! ہنسنا تو ازل سے آپ کی قسمت میں نہیں جس غریب کو کھانے کو گھاس پات اور "ستر پوشی" کو ہاتھ کا بنا ہوا شدھ کھدر ملے وہ بھلا کیا خاک ہنسے گا۔ ہاں! اپنی قسمت کو صبح اٹھتے ہی کوسنا شروع کر دے تو چاروں مذہب حلال!

ہاں! سنتے ہیں کہ لاہور شہر میں جو ایک صنعت و حرفت کی نمائش ہونیوالی ہے

اس میں محکمہ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی خاص اہتمام سے کچھ کھدر پوش کانگرسی بھی ایک کیمپ میں رکھے جائینگے۔ لیکن خیر! ان مسائل سے ہمیں کیا واسطہ! یہ تو کانگرس کے چھوٹے باپو پنڈت جواہر لال صاحب نہرو سے پوچھیئے۔ جو لندن جاکر تو شکل و صورت سے پورے "جان بل" بن جاتے ہیں لیکن بھارت ماتا میں آتے ہی منو کے دہرم شاستر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ مگر یہ گمبھیر "مسائل ہم کیا جانے ہم تو ایک مزاح نگار ہیں

ہاں! کبھی دوسروں کی دیکھا دیکھی شعر بھی کہہ لیا کرتے ہیں مثلاً۔

ہمیں ان سے محبت ہے حماقت اس کو کہتے ہیں
وہ دشمن سے ہیں ہم صحبت شرافت اسکو کہتے ہیں

کبھی تہمت تراشی کی کبھی دشنام بازی کی
حماقت اسکو کہتے ہیں ظرافت اسکو کہتے ہیں۔

جواب وصل خاموشی وفاؤں کا صلہ جوتے
بلاغت ہو تو ایسی ہو فصاحت اسکو کہتے ہیں

مریدوں کو کیا مفلس مشیخت نام ہے اس کا
اڑالی ساتھ بیوی بھی کرامت اس کو کہتے ہیں۔

نہتھوں پر تو بم مارے مگر پولیس جب دیکھی
خواتین کو کیا آگے شجاعت اس کو کہتے ہیں

نظر تک کی نہ شوہر پر نہ ہے پاسِ حیا داری
کلب والوں سے کھل کھیلیں سخاوت اسکو کہتے ہیں

وہ بولیں طعن سے ہم بے حیا ہیں بے حمیت ہیں
کہا اسلم نے "ہاں سچ ہے حمایت اسکو کہتے ہیں



ظرافت

ظرافت

مغرب کے مشہور "ملا" سٹیفن لی کاک کا ایک مضمون عدم آباد گزٹ میں ظرافت پر شائع ہؤا تھا اسمیں مزاحہ نگار کی تعریف جو لکھی ہے ہم صرف "شاہجہان" والوں کی خاطر یہاں نقل کئے دیتے ہیں۔ کیونکہ دہلی سے جناب ناصری صاحب کا حال ہی میں جو وارنٹ طلبی مضمون بلا ضمانت ہمیں موصول ہؤا ہے۔ اس میں صاف لکھا ہے کہ کوئی مختصر سا مضمون شاہجہان کے لئے بھیجئے۔ اور اسکے ساتھ بڑے تجربہ کار لوگوں کی طرح ہم سے وعدہ بھی کیا گیا ہے کہ آیندہ وہ ہمیں اس قسم کی ناجائز تکلیف جسے اصطلاح میں بیگار میں پکڑے جانا کہتے ہیں کبھی نہ دینگے ہم اپنے دہلوی احباب کی خاطر یہ کہنے کی جرأت تو کر نہیں سکتے کہ اس قسم کے چکموں میں ہم کچھ کم ہی آیا کرتے ہیں، لیکن خیر! سب سے پہلے جناب ناصری صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنیکی اجازت چاہتے ہیں کہ "مرزا جی" کے حال پر تو اب رحم ہی فرمائیے۔ وہ غریب تو جناب مولوی شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ساقی کے سر کو دعا دیتے ہیں کہ آپ کی نظر عنایت سے ان کی وہ تشہیر ہوئی کہ بس توبہ ہی بھلی۔

اردو رسائل کے ایڈیٹر صاحبان سے تو خدا ہی سمجھے کہ ان شریف لوگوں نے گڑے مردے اکھیڑنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مرزا جی کی "بست و بود" کو ایک مدت ہو چکی۔ لیکن یہ حضرات اب بھی انہیں کاغذی پیراہن پہنائے چلے جاتے ہیں۔ پھر ہزار آفرین ہے ہمارے "ہندی ہندوستانی" بھائیوں پر جو مرزا جی ایسے بھولے بھالے آدمی کو کئی بار شدھ کر چکے ہیں۔ اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہونے پائی اور پھر یہ دہلی براڈ کاسٹنگ والوں پر اردو (جسے وہ ہندوستانی کہتے ہیں) کی ہی مار۔ ان شریف لوگوں نے تو مرزا جی غریب کو معجون مرکب ہی بنا ڈالا۔ شاید کسی حکیم نے بتلایا ہوگا۔ کہ دس پانچ مضامین کا "گھوٹم گھوٹا" جسے اردو داں معجون مرکب کہتے ہیں بنا ڈالو اور اس جدت کی بحیثیت مرزا جی کے مصنف کے بھی ہم داد دیتے ہیں کہ کسی کتاب کی "مقبولیت عام" پر زنگ دلی کی ضرب لگانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں کہ معمولی معمولی کتابوں کے مضامین تو "مفرد" ہی براڈ کاسٹ کر دئے جائیں۔ اور ایک ایسی کتاب جس کے بیشتر مضامین ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکے ہوں انہیں "مرکب" بنا کر براڈ کاسٹ کیا جائے۔ تو خیر! اسی طرح ہم ان علم دوست حضرات کے بھی سپاس گذار ہیں جنہوں نے اپنے اپنے فہم اور اپنی اپنی بساط کے مطابق مرزا جی کی نقل اتارنے کے لئے بقول مرزا داغ ؎

ے انگلیاں گھس گھس گئیں وہ خامہ فرسائی ہوئی

لیکن نتیجہ وہی نکلا کہ ع

ہوُا پر نہ ہوُا میرؔ کا انداز نصیب!

لیکن ہم ان سب باتوں کا ذمہ دار علی رؤس الاشہاد "ساقی جی" کھاری باؤلی والے کو ٹھہراتے ہیں۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں۔ کہ داورِ محشر کے حضور میں جب مزاجی داد طلب ہونگے تو ہمارا قلم سب سے پہلے ساقی والوں کے خلاف گواہی دیگا کہ مزاجی کے متعلق جو کچھ زبان و دہن سے نکلا۔ ساقی والوں کی تحریک سے نکلا تو جبر!

یہ تو ذرا سرسے رلہے تھا۔ اب سٹیفن لی کاک کا قول سنئے!

"حقیقت میں مزاح نگار وہی ہے جسے ہجوم افکار نے پریشان کر رکھا ہو۔ خاموشی پسند ہو۔ خشک مزاج ہو"۔ لیکن تنگ دامنی کے مرض میں گرفتار نہ ہو۔

اب کوئی جناب ناصری صاحب سے اتنا تو پوچھے کہ کیوں جی! "سٹیفن لی کاک" کے قول کے مطابق ہم آپ کو مزاح نگار ہی نظر آتے ہیں۔ یا آپ نے محض سنی سنائی پلے باندھ لی ہے۔ بریں عقل و دانش! اب آگے کیا کہیں ہم

مزاحہ نگاری کوئی تعریف کی بات نہیں۔ آج اس زمانے میں شخص اپنے

آپ کو ظریف سمجھنے لگتا ہے۔ بعض کے یہاں "یاوہ گوئی" اصلی ظرافت ہے۔ بعض گفتگو کے دوران میں اپنی چنگی بھلی شکل وصورت کو کارٹون بنا لینا ہی ظرافت سمجھتے ہیں۔ اکثر احباب کے یہاں لباس کا بے ڈھنگا ہونا ہی ظرافت کا اعلےٰ معیار سمجھا جاتا تھا۔ ہمیں خوف ہے کہ کہیں کوئی صاحب اس موضوع پر ہم سے "مبارزہ طلب" نہ کرنے لگیں۔ اس لئے ہم اس بحث کو یہیں ختم کئے دیتے ہیں۔ کیونکہ جب "اردو ہندی اور ہندی ہندوستانی کا قضیہ" موجود ہو تو پھر کسی اور موضوع پر بحث کرنا "کوڑ مغزی" کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

تو مختصراً عرض ہے کہ انسان پر جب ہجوم افکار کا غلبہ ہوتا ہے اور "کوئی امید بر نہیں آتی" والا مضمون بن جاتا ہے تو قدرت اسے ایک ایسی قوت عطا کر دیتی ہے کہ اس کا اظہار یا مظاہرہ دیکھنے والوں یا سننے والوں کے لئے سامان تفریح بن جاتا ہے۔ حقیقت میں مزاح نگاری کوئی آسان چیز نہیں۔ اگر اسے افسانہ نگاری کی ایک شاخ تسلیم کر دیا جائے تو یہ فن سب سے مشکل ہے۔ مزاحیہ نگاری ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا فن ہے جس سے کہنے والا ایک کڑوی بات بھی ایسے لطیف انداز سے کہہ جاتا ہے کہ سننے والے کو ناگوار معلوم نہیں ہوتی یعنی انداز بیان میں ایک

خوشگوار کیفیت پیدا کر دینا اصل مزاح نگاری ہے۔

جیسے کہ پہلے عرض ہو چکا ہے اکثر لوگ شکل و صورت سے اپنے آپ کو ظریف اور بزلہ سنج ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن قسم لے لیجیے! ہنسنا تو رہا درکنار ان کے گدھے پن پر رونا بھی نہیں آتا۔ اگر آپ اس خیال سے خامہ فرسائی فرماویں کہ آپ کی تحریر پڑھ کر انسان "لوٹن کبوتر" بن جائے۔ تو یقین جانئے کہ جہاں تک ظرافت اور مزاح کا تعلق ہے آپ کی تحریر گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچ سے زیادہ پر لطف نہ ہوگی آمد اور آورد کا جو تعلق شعر سے ہے وہی بات مزاحیہ نگاری میں ہے۔

تحریر میں مذاق یا مزاح کا رنگ پیدا ہونا طبیعت کی افتاد پر منحصر ہے۔ وہ لوگ جو تفکرات میں گھرے رہتے ہیں اور زیادہ غور و فکر کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ خود تو ڈوبتے ہی ہیں۔ لیکن ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ لیکن وہ پاک نفس جو یہ سمجھے کہ ؎

دم زندگی رم زندگی۔ غم زندگی سم زندگی

غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری!

وہ آپ کو ہر حالت میں خوش اور قانع نظر آئیگا۔ اس کے شکوہ کرنے کے

انداز میں بھی ایک لطف پنہاں ہوگا بیفکری اور مزاح میں قدرتی میل جول ہے۔ گو اس کا اظہار بہت کم ہوتا ہے۔ وہ شخص کبھی مزاح نگار نہیں ہو سکتا جو ہمہ چوں ما ڈنگرے نیست! بنا پھرتا ہو۔ جو شخص زندگی کی تگاپو میں ہر ہم نفس کو نیچا دکھلانے کی فکر میں رہے اس کی طبیعت میں ظرافت نام کو بھی نہیں ہوتی۔

مزاح یا ظرافت ان لوگوں میں آپ پائینگے جو دنیا کے سرد و گرم سے آشنا ہو چکے ہیں۔ مزاح حقیقت میں دل بہلانے کی ایک چیز ہے خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو - لیکن خیر! یہ تو محض کام کی باتیں ہیں جنکا ذکر تضیع اوقات کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آپ جانتے! کہ عام طور پر حاکم۔ قومی لیڈر۔ قومی کارکن "علماء فینشن" اور بڑے نام کے ادبا ظرافت سے اتنے ہی کورے ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے "ہندی ہندوستانی بھائی" جنہیں اصطلاح میں یاران وطن کہتے ہیں رواداری یا جذبہ وطنیت سے محروم!!

لیکن وہ بزرگ جو قوم کے نام پر روپیہ سمیٹنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہوں اور "حساب کتاب" دینے یا رکھنے سے اس طرح خائف ہوں جیسے شیطان لاحول سے۔ ان کی عادات واطوار میں ظرافت ضرور پائی جاتی ہے اور شکل و صورت دیکھ کر بھی

کبھی ہنسی آجاتی ہے۔

بعض اوقات کسی قوم کی قوم کو کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا ہے۔ کہ وہ عقل و ہوش سے سبکسار ہو کر "اصالتاً" یا "وکالتاً" ظریف بن جاتی ہے اور جب سر پھٹول اور لپاڈگی کے لئے اور کوئی بہانہ نہیں ملتا تو زبان کا جھگڑا لے بیٹھتی ہے۔

جناب ناصری صاحب بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس مرض کا کبھی شکار رہ چکے اور کبھی کبھی ظرافت کا دورہ اب بھی انہیں پڑ جاتا ہے مثلاً مضمون تو ہم سے منگوایا وارنٹ بھیج کر لیکن رسالہ میں مضمون کے لئے جگہ ہی نہ ملی۔ اور "جاتے چور کی لنگوٹی" سمجھ کر اسے ادھر ادھر جہاں کہیں کوئی کونہ بچتا نظر آیا ٹھونس دیا۔ فرمائیے! اس سے

ہوگی۔ ہاں! یہ ہرگز نہ بھولئے گا کہ جو شخص اپنے منہ سے ظریف بنے اسکی تحریر پڑھنے سے گریز کیجئے ورنہ ممکن ہے کہ لوگ آپ کو دیکھ کر "خرِ عیسیٰ" کا ذکر لے بیٹھیں۔

جہنم کے وارث

جہنم کے وارث

جھگڑا تو صرف اس بات پر تھا کہ اگر بقول مولینا حالی مرحوم۔ ع

جہنم کو بھر دینگے شاعر ہمارے!

تو پھر اور شریف لوگ کہاں جائینگے۔ خاص کر افسانہ نویس! اس کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہو گیا کہ مذہب کے مقدس کتب میں (جو آجکل طاق نسیان پر رکھی رہتی ہیں۔ اگر جہنم صرف گنہگاروں کا گہوارہ قرار دیا گیا ہے۔ تو اگر کہیں ہمارے نازک خیال شعراہی جہنم کی گرما گرم کوٹھڑیوں میں گھسے رہے تو پھر وہ بھلے مانس جو محض اس لئے گناہ کرتے ہیں کہ آخر کہیں اللہ میاں کی محنت بھی تو ٹھکانے لگے کیونکہ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ جہنم بری ہے یا اچھی۔ لیکن ہے تو اللہ میاں کی بنائی ہوئی دیکھئے! بات میں بات نکل آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جہنم اللہ میاں ہی نے بنا رکھی ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ میاں جو خیر سے بہت ہی ارفع و نہایت ہی اعلےٰ درجے کے مقدس واقع ہوئے ہیں۔ ایک ایسی چیز کا حکم دیں جو دنیوی نقطہ نظر سے حد درجہ کی ناپاک خوفناک اور عذاب دہ ہو۔ خیر! یہ مسئلہ تو چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ یہ تو ایک محض مولویانہ بحث ہے جسے حکماء مغرب نے فیشن پرستی کے مندر میں جمع ہو کر "بحث" کا نام دیا ہے لیکن قسم

لے لیجیے کہ ہم تو

دل اپنا پاک کرکے نیت کو صاف کرکے!

بطور کلمۃ الحق اعلان کیئے دیتے ہیں کہ ہمارا "مولوی جی" جو یاران نکتہ دان کے حلقے میں "مولوی پیغام صلح" جسے یار کی گلی والوں کی اصطلاح میں "روٹھے کو منانے والا" کہتے ہیں کیطرف ہرگز اشارہ نہیں۔ کیونکہ اسمبلی کے الیکشن کا جھمیلا روز روز تھوڑا ہی پیدا ہوتا ہے۔ جو "مولوی جی" "محسن کشی کے ٹکے چکاتے پھرا کرینگے۔ اور ناصریت کا جھنڈا بلند کرکے کسی "پاجی" کی مخالفت کرتے کرتے اپنی خباثتِ طینت کی سیاہ کاریوں" دبالکل نئی ترکیب ہے اسے ایک محسن کی دل آزاری اس سادگی سے کرینگے جس طرح اندرون شہر کے "خواجہ" والوں نے خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر اور تعاون کا یقین دلا دلا کر ایک شریف دوست سے غداری کرکے اپنے ایمان اور اسلام کا ایک نیا ثبوت دیا تھا۔ اور پھر کچھ روز بعد اسلام کی بیٹیوں نے کئی ایک مقامات پر اپنے رنگ رنگ کے دوپٹے اور برقعے اچھال اچھال اور تالیاں بجا بجا اور کولہے مٹکا مٹکا کر اپنی حریت کا اعلان کرکے غیر مسلموں کو دکھا دیا تھا کہ تو سمجھو لو دیکھ لو اسے کہتے ہیں ایک مسلم عورت کی غیرت۔ پڑھیئے تو ذرا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

حضرت اقبالؔ نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا کہ

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا

اسے معاذاللہ! ایک وہ ہیں کہ عمر عزیز پیشینگوئیاں کرنے کرتے کٹ جاتی ہے اور پوری ایک بھی نہیں ہوتی اور ایک یہ اللہ کا بندہ ہے کہ جو اس کی زبان حقیقت ترجمان سے نکلتا ہے پورا ہو کر رہتا ہے جانے! قدرت کو اس فلسفی شاعر سے کیا کد ہے +

تو خیر! یہ تو سرے راہے تھا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ شریف آدمی جو کوتاہ بینیوں کی نگاہ میں گنہگار قرار پاتے ہیں۔ گناہ اگر واقعی بری ہی چیز ہے تو پھر گناہ کے مرتکب کیوں ہوتے ہیں اگر کوئی تعصب کی عینک آنکھوں سے ہٹا کر دیکھے تو اسے اس میں بھی ابن آدم کی عبودیت کی شان نظر آجائے گی یعنی غریب گناہ کرتا بھی ہے۔ تو صرف اس لئے کہ اللہ میاں کی جہنم کہیں سونی نہ پڑی رہی؛

اب سوچنے کی یہ بات ہے کہ اگر واقعی جہنم کہیں نصیب دشمناں شعراسے ہی بھر دیا گیا تو مخلص گنہگار کہاں بھٹکتے پھرینگے۔ کہیں وہ بات نہ ہو کہ رع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم !

اور آپ کے لئے رہ گئے صرف دھکے ہی دھکے اور اسی طرح چونکہ عربی کی لغت میں جھوٹ بولنا۔ بکنا یا فرمانا المرانب جب گناہ قرار دیا گیا ہے تو پھر یہ مصنّف لوگ سر چھپانے کا آسرا کہاں ڈھونڈینگے۔

تو جناب! کوئی پہر بھر سے یہی مسئلہ زیر بحث تھا اور یار لوگوں کی دستار فضیلت کے اچھلنے کے سامان ہو چکے تھے۔ اور کئی مرنجاں و مرنج قسم کے لوگ اب صرف ہاتھا پائی۔ لپا ڈگی۔ دھینگا مشتی اور گھونسہ بازی کے روح پرور مناظر دیکھنے یا دکھانے پر تلے بیٹھے تھے۔ لیکن آخر ہم سے نہ رہا گیا اور ہم نے کہا کہ اسے بھلے مانسو! یہ نکتہ صرف عقل سے حل ہو سکتا ہے لیکن خوبی قسمت سے ہم لوگ عقل سے کچھ اس طرح تہی دست ہیں۔ جیسے کسی مولوی کی پیسے دھیلے سے جیب اور وہ غریب چند ٹکوں کیخاطر ایمان تک بیچ ڈالتا ہے!

تو خیر! بزرگوں سے جو عقل سلیم ہمیں عطا ہوئی ہے۔ اس کے بل بوتے ہم یہ جھگڑا چکائے دیتے ہیں۔ تم جانو کہ زمانے کی کالے حروف والی بیاض کے اندر یہ صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ اگر واقعی جہنم کسی خوفناک مقام کا نام ہے تو پھر مصنّف غریب اس سے محروم ہی رہیگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس غریب پر جس شدت کے ساتھ اس کے

جیتے جی نکتہ چینی کی جاتی ہے اس کی تلخی تو نارِ جہنم سے بھی کچھ سوا ہی ہوتی ہے۔ تو جناب! یہ اسناد لال سنکر ہمارے بڑے بڑے "قلم گھسیٹے" دنگ رہ گئے۔ ہر طرف تحسین و آفرین کا شور بلند ہوا لیکن ہم نے کہا۔ اے ختم جا بیٹے ذرا! ابھی دامن صبر و تحمل سمیٹ سمیٹ کر رکھئے۔ کیونکہ ہمارا "گھسنا" تو ابھی ختم نہیں ہوا۔

تو جناب اب سب لوگ بقول جناب ہاشمی "کانوں کی آنکھیں" کھول کر تیار ہو بیٹھے تو ہم نے کہا کہ ہم تو مر کر بھی اس بات کے قائل نہ ہوں کہ شعرا جہنم میں ٹھونسے جائینگے۔ کیونکہ بزمِ گیتی میں ایک معشوق کی عزت صرف شاعر کے "دم قلم" کی بدولت ہے۔ یہ شاعر ہی ہے جسکے طعنوں سے جل جلکر ایک ستم شعار معشوق مائل بہ کرم ہو جاتا ہے۔ شاعر کا اگر کوئی جرم ہے تو کوئی خطا ہے تو کچھ قصور ہے تو صرف اتنا ہی کہ شریعتِ شعرا میں جھوٹ کہنا یا فرمانا (شاعر کی شاعرانہ حیثیت کیمطابق) کمالِ فن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مصنف کیطرح زندگی میں تو نہیں لیکن نسبت کے جنجال سے نکل کر جو اس غریب کی گت بنتی ہے بس توبہ ہی بھلی۔

دُور کیوں جاؤ مرزا غالب کو ہی دیکھ لو نا کہ غریب کو "بیگانوں" سے جان چھڑائے برسوں گذر گئے۔ لیکن آج تک عف عف کی صدائیں ادھر ادھر سے آتی ہی رہتی ہیں۔ بڑے بڑے جگادھری قسم کے "ادبی سپوت" "بغضِ یزید کی تقلید میں مرزا غریب پر برستے

ہی چلے جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح ایک ھمبھیری کے اڑنے سے ساون نہیں آسکتا۔
اسی طرح ہرکس وناکس کا کہا سند بھی نہیں مانا جا سکتا۔

کچھ روز ہوئے "پیرمیخانہ" کے یہاں کسی شخص نے بیٹھے بیٹھے امرد پرستی پر اشعار پڑھنے شروع کر دئے۔ اور لطف یہ کہ جب تان ٹوٹی تو غریب غالبؔ پر ہی۔ یار لوگوں نے کہا بھئی! حد ہو گئی یہ تو کوئی پرانا کھلاڑی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کے حقائق تو صرف وہی بیان کر سکتا ہے۔ جس پر کبھی ایسی "نار" پڑ چکی ہو۔ طرز بیان اتنا دلکش کہ سبحان اللہ! غالب کے چند اشعار گا لینے یا سنا لینے کے بعد ان کی تشریح اس رنگ سے بیان ہوتی ہے کہ بلزکؔ کی "ڈرول سٹوریز"
"Drool stories by Balzac." کا لطف آجاتا۔
سننے والے حیران تھے کہ مرزا بیگانہؔ کیا کم تھے جو ایک اور بیگانہ پیدا ہو گیا۔ تو جناب! دل کا بخار اس طرح بھی نہ نکلا تو پھر عجز و نیاز کا دامن تھام کر اردو کے حامیوں سے یہ التجا کی گئی کہ اردو کے نام پر غالبؔ کا وہ تمام کلام جو ہمارے نقطۂ نظر سے ناپاک ہے جہاں جہاں ملے فراہم کر کے تلف کر دو۔
کیا اچھا ہوتا کہ یہ حضرت جو "شاداں" تخلص کرتے تھے اس کے ساتھ اتنا اور

بھی کہہ دیتے کہ اگر ہماری عرضداشت پر غور نہ ہوا تو ہم اردو کے خلاف ہندی کا پرچار کرنا شروع کردینگے۔ دیکھا آپ نے؟ اسے کہتے ہیں ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ! اب رہا آپ کا افسانوی رنگ یعنی جس رنگ میں غالب کے اشعار کی ہوم لگنڈ" تشریح فرمائی جاتی تھی۔ تو اس کے متعلق صرف ایک لطیفہ سن لیجئے۔ ایک صاحب افسانے لکھا کرتے تھے لیکن مدیر صاحبان اپنی بدذوقی کے باعث ان کے افسانے شائع کرنے سے انکار کر دیا کرتے۔ ان افسانہ نویس صاحب کے ایک صاحبزادے بھی تھے بڑے نٹ کھٹ۔ پڑھنے لکھنے کے نام سے اس طرح بھاگتے جیسے شیطان لاحول سے ایک روز ماں نے کہا

ابے! اگر پڑھے گا نہیں تو آخر کرے گا کیا"

"اماں!" صاحبزادہ صاحب اکڑ کر بولے۔" اباکی طرح افسانے لکھا کرونگا۔

سمجھ گئے نہ آپ؟

تو آپ خدا کو حاضر ناظر جان کر ٹھنڈے دل کے ساتھ قطعی اطمینان رکھئے کہ جہنم میں نہ تو شاعر جائینگے اور نہ مصنفین کو جگہ ہی ملے گی۔ رہے گنہگار لوگ تو ان کا جانا بھی معلوم۔ کیونکہ بقول حضرت اقبال رح،

جنس عصیاں عجیب شے ہے!

جیسے روزِ محشر خدا کی رحمت کے علمبردار ڈھونڈ ڈھونڈ نکالیں گے۔

توجناب! جہنم میں صرف پبلشرز؎ جنہیں عرف عام میں کتب فروش کہا جاتا ہے ٹھونسے جائینگے۔ کیونکہ یہ لوگ جس جس طرح غریب مصنفین کو دھوکا دیتے ہیں اس کا حال یا تو خدا ہی جانتا ہے یا ان کا اپنا کالا ضمیر اور جو کتابیں انہوں نے مقررہ تعداد سے زیادہ شائع کی ہونگی۔ انہی کی آگ میں جلا کرینگے اور محض انہی گندم نما جو فروش زر پرست لوگوں کی "برکت" سے جہنم آباد رہیگی؛

آداب عرض۔



؎ اس کتاب کا پبلشر ہرگز نہیں۔

ساس کا خط بہو کے نام

شادی سے پہلے

ساس کا خط بہو کے نام

شادی سے پہلے

میرے لڑنے جھگڑنے کے ارمانوں کا خزینہ اور میرے وقت بے وقت کے غصہ کا تختۂ مشق بننے والے انمول موتی! جیو اور بہت جیو! میری دعا ہے کہ تم جلد از جلد اس راز سے واقف ہو جاؤ کہ ساس کس بلا کا نام ہے خدا مجھے وہ دن جلد دکھائے جب میں تم دونوں (بیٹا اور بہو) کو آباد اور خوش دیکھ دیکھ کر ایک زخمی سانپ کی طرح پیچ و بل کھاؤں۔ اور تمہاری بات بات پر ناک بھوں چڑھاؤں۔

بیٹی! میری کس قدر تمنا ہے کہ جب تم آؤ تو تمہیں آنکھوں پر بٹھاؤں تاکہ ایک ساس کے نوکِ مژگاں کا ذرا تم بھی مزا چکھ لو۔ تمہیں اپنے دل میں جگہ دوں تاکہ تم کہیں آتے ہی گھر پر قبضہ جما کر مجھے بے دخل نہ کر سکو۔

میں خدا کی بے حد احسان مند ہوں کہ اس نے مجھے زیور علم و سعادت سے آراستہ ایک "بہو" عنایت کی تاکہ اسے بھی میری جہالت دیکھ کر کچھ مسرت حاصل

ہو۔ اور اُسے معلوم ہو کہ بہو بن کر عورت کس مصیبت سے دوچار ہوتی ہے۔

پیاری بیٹی! تمہارا خیال تو میرے دِل میں محرم کا چاند بنکر چمکتا ہے۔ اور میری رُوح تمہاری آمد آمد کے خیال سے فنا ہونے لگتی ہے۔ اور میں تو اُس گھڑی کا انتظار کر رہی ہوں جب تم سے بھی دو دو ہاتھ ہونے کا مجھے موقع مل سکیگا۔

ہاں! مجھے یہ معلوم کر دکھ ضرور ہوتا ہے کہ تم خانہ داری کے امور کو خوب سمجھتی ہو۔ اور اس سے دلچسپی بھی لیتی ہو کیونکہ اس سے مجھے اپاہج بنکر رہنے کا خوف ہونے لگتا ہے۔

بیٹی! میرے گھر کا راج چھوڑنا کسے پسند ہے۔ اور یہ تو مجھے تم ایسی سعادتمند سے امید ہی ہے کہ تم آتے ہی میاں کو لیکر الگ مجلس جماؤ گی۔ لیکن میری جان! مجھ سے نمٹنا اتنا آسان بھی نہ سمجھ رکھو۔ میں تو بات بات پر قربان ہو جانیوالی ہوں۔ میں تو اللہ میاں کی درگاہ میں دونو ہاتھ اٹھا اٹھا کر التجا کرتی ہوں کہ جب تک میں زندہ رہوں تمہیں ایک پل کا بھی چین نصیب نہ ہو۔ تمہاری نند بھی تم سے ایک آدھ جھپٹ لینے کو تڑپ رہی ہے۔ خدا تمہیں ہماری بدمزاجی کا تختۂ مشق بننے کے لئے سلامت رکھے۔

عالم دوبارہ نیست

عالم دوبارہ نیست

کسی حکیم کا قول ہے کہ

ابتدائے آفرینش سے انسان آرام اور راحت کے لئے محنت اور مشقت کرتا چلا آرہا ہے لیکن قسمت میں وہی پاؤ بھر آٹا اور وہی چار گرہ کپڑا جسکی قسمت میں ہو عاشق کا گریبان ہونا لکھا ہے وہ آپ ہماری جانب سے ڈیڑھ گز زمین بھی شامل فرمالیجئے! تحصیل علم کی خاطر پڑھتے پڑھتے فاتر العقل ہو جاتا ہے۔ تفکرات اور پریشانیوں میں آٹھوں پہر مبتلا رہ کر بھی دو گھڑی کا اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ ایک غلطی پر نادم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خوفناک غلطی کا مرتکب۔ ایک گناہ سے تائب ہو کر توبہ کرتا ہے تو اس سے بھی بڑے گناہ کا عذاب سر پر لیتا ہے ایک بری عادت چھوڑتا ہے تو دوسری کا شکار ہو جاتا ہے وہ لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے اور لوگ اسے الّو بناتے ہیں

اس لئے اصل خیر سے عقلمند صرف وہی ہے جو کہ

ہے بہار باغ دنیا چند روز!

کے کسی سیلانی نے بڑے معنی اور مطلب سمجھ کر چند دن کی زندگی کی عملی داد دے کیونکہ مہابلی کے دادا جان نے بھی تو یہی کہا ہے کہ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

اور حکمت کی کتابوں میں چونکہ بادشاہ کو ولی (ولی وکنی نہیں) لکھا ہے اس
لئے ایک ولی کی بات پر عمل پیرا ہونے سے بچپن کی غلط کاریوں کا خود بخود علاج ہو جاتا
ہے اور جو آپ کو یقین نہ ہو تو کسی عامل باعمل سے جسے اصطلاح میں گرگ باراں دیدہ
یعنی پیر دانا اور ہندی میں "گھاگ" کہتے ہیں پوچھ لیجئے کہ کیوں حضرت! وہ جو آپ کے یہاں محفل
شرمائے جس سے خلوت جلوت ہیں وہ "مزا" ہو
والی مجلس منعقد ہوا کرتی ہے آخر اسکی وجہ کیا ہے تو جواب ملیگا کہ عالم دوبارہ نیست! لیکن
شرط یہ ہے کہ پیر ایسا ہو جو کبھی وجد میں آکر سے

نہ گئی دل سے ہیبت کے حسن پرستی نہ گئی
بجھ گیا خون مگر روح کی مستی نہ گئی!

کہنے لگے۔ تو جناب! اگر اس قسم کے "سبزوار بزرگ" ہمارے بھیاں نہ نکلیں تو پھر
ہمیں بھی کوئی فسادیا ہی سمجھ لیجئے۔

ہاں! آپ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ جب ہم اس عالم ہست وبود میں پوری آدمیت
کے ساتھ دادِ زندگی دے رہے ہیں اور لے رہے ہیں تو پھر عالم دوبارہ نیست کا رونا کیسا

سنئے! عرض کیا ہے کہ آپ غالباً جناب چراغ حسن صاحب حسرت کے نام سے جو تاریخ ولادت تعایت بقر بدیت یہ محض ایک برہمچاری تھے اور جنہوں نے "تفسیر حیات" کا دیباچہ لکھ کر ہمارے سر پر احسان کا چھپر رکھدیا ہے۔ ضرور واقف ہوں گے راوی دریائے راوی نہیں! کہتا ہے کہ ایک روز آپ بیٹے لیٹے اپنی حیات کے جواز اور عدم جواز پر غور فرما رہے تھے کہ آپ پر ایک کیف بیخودی طاری ہو گیا اور اس ہیجان عظیم کے دوران میں آپ اچانک "چپو چلے" "چپو چلے" کا نعرہ مارنے لگے۔ اب احباب حیران ہیں کہ حسرت صاحب جو شکل و صورت سے بھی ع

یہ وہ حسرت ہے جس حسرت کی خود حسرت کو حسرت ہو!

نظر آتے ہیں یہ چپو چلے چپو چلے کیا لے بیٹھے۔ اور اختر مہاراج نے جانا کہ ہو نہ ہو۔ "چپو" قافیہ اور "چلے" ردیف ہو گی اور زمین چونکہ سنگ للاخ ہے اس لئے شاعر فکر سخن کے لئے "چپو چلے چپو چلے" کا قافیہ ردیف رٹ رہا ہے۔ ادھر ہم نے ایک روز حافظ "عالمگیر" صاحب سے پوچھا کہ حضرت آپ بھی تو بڑے تجربہ کار ہیں بھلا بتلایئے تو سہی کہ ایک برہمچاری شاعر کی اس "چپو چلے" سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ وہ مسکرا کر بولے کہ بس میاں! اتنی بات بھی نہ سمجھ سکے تم۔ شاعر کہتا ہے کہ ع

جینے کا تب مزا ہے جب چپو چلا کرے!

ہم نے کہا بس رہنے دیجیئے حضرت! آپ ہمیشہ اپنے ہی دل کی بات کہا کرتے ہیں لیکن جب پوچھو ایجنسی سے "شیرازہ" کے دفتر میں یہ رپورٹ پہنچی کہ حسرت صاحب ادبی دنیا سے گھریلو دنیا میں منتقل ہو گئے ہیں لو۔ وہ بھی "ترٹ" کے روز۔ تو ہمیں جناب حافظ "عالمگیر" صاحب کی پختہ کاری کی داد دینی ہی پڑی۔ گو یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ عید بعد ترٹ کیوں عید ہی منائی ہوتی۔

لیکن ہم تو تب ہی جان گئے تھے جب سندباد نے خود کہہ دیا تھا کہ ؎

دل میں ہیں تمنائیں
ڈر ہے کہ کہیں ہم تم بدنام نہ ہو جائیں۔

ممکن ہے کوئی خط ہی پکڑا جائے اس لئے ؎

اب اور نہ ترٹپاؤ
یا ہم کو بلا بھیجو (پونچھ)، یا آپ چلے آؤ۔ (لاہور)

لیکن کوئی پڑھا لکھا حیوان ناطق اتنا نہ سمجھ سکا کہ جو شخص بزم ادب (لاہور والی نہیں) میں اپنے علم و عقل سے چراغاں کئے ہوئے ہو اسے "تمنا اور ترٹپنے" سے کیا کام؟ حالانکہ صاف ظاہر تھا۔ کہ ؏

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

لیکن معشوق کی ضرورت کیوں آپڑی؟ محض اس لئے کہ "عالم دوبارہ نیست!

اب رہی شادی خانہ آبادی تو اس کے متعلق ایک محرم راز سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ حسرت صاحب جب بزمِ نکاح میں آکر بیٹھے تو سہرا تو تھا نہیں گلے میں صرف پھولوں کا ہار تھا اور شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ مینڈھا بازی جیت کر آیا ہے۔

آداب عرض! حسرت صاحب!

یہ لاہور ہے

یہ لاہور ہے

بھلا یہ بھی کہیں کی "بھلمانسیت" ہے کہ کسی چنگے بھلے آدمی کو یہ کہدیا جائے کہ لو میاں ذرا لگے ہاتھوں مزاحہ نگار تو بن جاؤ۔ ائے معاذاللہ مزاحہ نگاری نہ ہوئی نقالی ٹھہری یعنی وہی جس کے متعلق کل ہیرا منڈی میں ایک علامہ یہ کہہ رہا تھا کہ "نقل کفر کفر نہ باشد"۔ چلو چھٹی ہوئی اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ تو خیر ہم نے تو جہاں تک عقل دوڑائی بس اتنا ہی معلوم ہؤا کہ ہو نہ ہو یہ مزاحہ نگاری بھی ایک قسم کا مرض ہے جس کا دورہ اکثر پڑھے لکھے آدمیوں کو پڑ جاتا ہے اور جو یقین نہ ہو تو وہ "پینسٹھ روپلے کا دنبا" جو بقرعید کی شب کو دہلی کے براڈکاسٹنگ اسٹیشن والوں نے قربانی دیا تھا یاد فرمالیجئے ہے نا سر سے پاؤں تک "مزاجی" والے "چھاتہ اور چھتی" کی حرف بہ حرف نقل ہوگئی نا اب تو آپ کی تسلی ہا کچھ اور بھی عرض کریں۔ لیکن فی الحال نہیں کیونکہ "توراۃ" میں صاف لکھا ہؤا ہے کہ "داشتہ آید بکار"۔ اسی لئے تو بنی اسرائیل ایک من کا شکار دوسرے روز کیلئے رکھ چھوڑتے تھے

مزاح نگاری تو یار لوگوں نے بچوں کا کھیل جسے اصطلاح میں خالہ جی کا گھر کہتے ہیں سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ حضرت صفاء الملک نہ تو بہ شفاء الملک[1] قبلہ کا خیال تو یہ ہے۔ اس مرض کے جراثیم ذرا مشکل سے ہی کسی کے دماغ میں "گھس پاتے" ہیں۔ اب

[1] افسوس اب جنت مکان ہو گئے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

رہی آج کل کی مزاح نگاری جسکی یوپی والوں کے ہاں گرم بازاری ہے تو اسے اگر "اگڑم بگڑم نگاری" کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

لیکن تھم جائیے ذرا۔ پہلے ایک اعلان واجب الاذعان جو ابھی ابھی شرف صدور لایا ہے۔ سن لیجئے۔ از دمِ تحریر آپ ہمارے خاص خاص الفاظ جنہیں اہل فضل کے یہاں "ادبی نازک خیالیاں" کہا جاتا ہے استعمال کرنے یا بطور سند پیش کرنیکے "تادم مرگ مجاز نہ ہونگے۔

اب آگے چلئے! جس طرح آج کل فلمی ڈرامے محض "ایجادِ بندہ" ہی کے طور پر پردۂ سیمیں پر دکھائے جاتے ہیں اور عقل کے اندھے پاجامے اور دھوتیاں سنبھالے دیکھنے کے لئے بھاگے جاتے ہیں اسی طرح فی زمانہ اگر ہماری مزاحہ نگاری بھی "اگرچہ گندہ" ہی منصور ہونے لگے تو کچھ مضائقہ نہیں سبب ہے تو آخر "ایجاد بندہ" ہی یا اس میں بھی آپ کو کچھ شک ہے۔ ہاں! یہ تو کسی پرآن یا وید میں لکھا ہی نہیں کہ اے مرد ہوشمند! جب بات کرے تو عقل کے ترازو میں تول کر اور جو ہوسکے تو کسی ہومیو پیتھ کو زبان دکھا کر کیا کر۔ کیونکہ اس فرقہ کے حکیم زبان دیکھتے ہی دلوں کے بھید جان جاتے ہیں اور بات وہ منہ سے نکال جسے کم از کم بے شعور تو بخوبی سمجھ سکے اور جو داؤ چل جائے تو اس سے کچھ استفادہ بھی حاصل کرسکیں۔ ہاں! اڑی اڑی طاق پر بیٹھی! تو بات

ہی اور ہے۔ لیکن کسی کو کیا۔ بدنام بھی ہو گئے تو کیا نام نہ ہو گا۔ اور قسم ہے ہمیں اسی "ساڑھے سولہ آنے" کی جو ہم نے بقرعید کے روز پہلی بار "یہ دلی ہے" سے سنی۔ کہ مزاجی لکھ کر بدنام تو ہم بھی ہوئے۔ اور ہوئے کچھ خوب ہی۔ اسی لئے دو چار روز سے اب کفِ دست ذرا افسوس کے انداز سے ایک دوسرے سے گھسا کر ع

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے!

والا ریکارڈ ہم بجانا شروع کر دیتے ہیں اور لیلائے شب ہمارے لئے کروٹیں بدلتے بدلتے سحر ہو گئی! والا مضمون بن جاتی ہے۔ ہاں! ذرا دیکھئے تو سہی۔ خدانخواستہ کہیں مصرعہ تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ خوف ہے کہ کل کلاں کوئی بگڑے دل مدیر اپنی علمیت اور لیاقت کا پھندنا اڑاتے ہوئے لفٹ رائٹ کرتے کرتے نہ آجائیں۔ اور ہمیں شاعر سمجھ کر ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر اور جھجک جھجک کر اور لچک لچک کر ایک آدھ دو غزلہ کہنے کی فرمائشیں نہ کر بیٹھیں۔

شاید آپ حیران ہونگے (وہی جسے کرخندار غالباً حریان کہتے ہیں) کہ یہ کیا واہی تباہی بقول شخصے بکے اور بزعم خود ہم فرمائے جا رہے ہیں تو عرض ہے کہ ہم تو حرف مزاح نگاری کر رہے ہیں اور کہیں سے مانگ تانگ کر نہیں بلکہ سولہ آنے

فی البدیہہ فرما رہے ہیں۔ آپ جانیئے! اس وقت ہمارے خیالات کی ناؤ عِا
کجا دانند حالِ سبکساران ساحلہا!
بنی ہوئی ہے۔ دماغ کی کشتی خیالات کے ہلکے ہلکے ہچکولے کھا رہی یعنی وہی کہ
دھرم بھرم کی نیّا ڈولے
کھائے ہچکولے ہولے ہولے
اور قلم چل رہا ہے یہ اور بات ہے کہ آپ کے پلے کچھ پڑے یا نہ پڑے۔
لیکن تعجب ہے آپ تو ابھی سے کسمسانے لگے ہاں غلط فہمی پیدا ہونے کے اندیشہ سے ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ آپ کے اس کسمسانے سے ہماری مراد کسی کا وہ کسمسانا نہیں جسکے متعلق میاں امانت فرما گئے ہیں کہ ؎
زانوؤں میں جو لیا ساق بلوریں کو دبا
کسمسایا وہ بہت ناز سے پر ہل نہ سکا
اجی کان کو ہاتھ لگائیے! اجی ہمارا کسی کی طرف اشارہ ہو۔ ہم تو صرف مزاح نگاری کر رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ہم اس مضمون کے اہل ہیں بھی یا نہیں تو یہ ان مدیر لوگوں سے پوچھئے جو ہم سے "دے ببرے وآتا" کے وزن پر صرف مزاحیہ مضمون ہی مانگتے ہیں۔
اور ہماری "ظرافت مزاجی" جو گھر والوں کی اصطلاح میں خشک مزاجی کہلاتی ہے کا سکہ

ان بھلے مانسوں کے دل پر اس طرح بیٹھا ہوا ہے۔ جیسے حکیم نیرنگ خیال بیچاری کے دماغ میں یہ بات گھس چکی ہے کہ جب تک ہم ان کے حضور میں کوئی مضمون نہیں گذرانےگے۔ وہ بھی ہمیں رسالہ ہرگز نہیں دینگے حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ع

اڑیل سا ہو گیا ہے ان کی عقل کا ٹٹو!

اور ادھر ہم بھی خم کھانے والی اسامی نہیں (حکیم جی کوئی عندلیب شاداں تو ہیں نہیں جو اپنی "قابلیت بازی" یا "علمیت بازی" کا سکہ جمانے کے لئے غالب سے کم کسی پر برستا ہی نہیں جانتے) ہاں ! ہیں وہ بھی سچے۔ آخر چھ دام کا رسالہ ہے کوئی ووٹ تو ہے نہیں جو کسی کو مفت دے دیا جائے اور پھر شریف لوگ تو ووٹ کے دام بھی کھرے کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کے "کانگرسی ایمان" کی سب سے پہلی شرط بھی تو یہی ہے کہ ووٹ کے پیسے کسی سے لو اور ووٹ کسی اور کو دو تو پھر حکیم نیرنگ خیال کیوں اپنا باسی رسالہ مفت بانٹتے پھریں۔ خیر! اس موضوع پر اس وقت کچھ زیادہ خامہ فرسائی نہ کرینگے۔ کیونکہ ہم کوئی اخبار نویس تو ہیں نہیں۔ کہ مسلمانوں کو "اتحاد" کے خلاف تعلیم دیں اور نام مولا پارٹی بازی کے مرض میں گرفتار ہو کر چار ٹکوں کی خاطر احرار کے سر پر "احسان" کا چھپرا نہ رکھیں۔

واقعہ عرض ہے کہ ایک روز ہم "فرہنگ آصفیہ" کی چھوٹی بہن "نوراللغات" سے بیٹھے آنکھیں لڑا رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر جو بحق عینک محفوظ ہو چکی ہے ایک مرصع لفظ پر پڑی یہ مرصع لفظ تھا "جوتی پیزار" وہی جسے زندہ دلانِ پنجاب ذرا شوخی سے "جوتم پیزار" کہا کرتے ہیں لیکن اس جوتی سے ہمارا مطلب وہ شیخ ناسخ والی جوتی نہیں کہ ؎

آسماں سے نظر آتے ہیں تارے دن کو
تیری جوتی کے چمکتے ہیں ستارے دن کو

بلکہ وہ جوتی جس کے متعلق کسی "میاں" نے "بی بی" کی شوخیاں دیکھ دیکھ کر کہا تھا کہ ؎

رات دن جوتی اچھلتی ہے خدا خیر کرے
دھول دھپے کے سوا اور نہیں کوئی خیال

آپ جانیئے ایسا مزے کا لفظ دیکھ کر ہمارا دل بھی بس کلی کی طرح چٹک گیا لیکن معاف فرمایئے وہ چٹکنا نہیں کہ ؎

چٹکی کلی تو خون کے قطرے ٹپک پڑے!

ارے معاذ اللہ! خدا وہ دن نہ کرے کہ ہم ایسے سنگ دل ہوں جس کی

دست درازیوں سے کسی نے تنگ آکر کہا تھا کہ ع

بندہ پرور یہ محبت میں مصیبت کیسی!

تو جناب! اس جو تم بیزار کے جو روح پرور مناظر اور کیف آور تماشے ہم نے دیکھے ہیں۔ آجکل کے کانگرسی ایمان والے مسلمانوں کی غیرت اور حمیت کے سر صدقے اللہ میاں سب دشمنوں کو دکھلائے۔

دیکھیے یہ اب آٹھ بجے ہیں۔ اب ہم اپنا دیہاتی پروگرام بند کرتے ہیں ہمارے دیہاتی بھائی اپنا اپنا ریڈیو بند کر لیں؟

کیونکہ

دہلی ریڈیو براڈکاسٹنگ ایکٹ کی رو سے ہمارے دیہاتی بھائیوں کے لیئے دیہاتی پروگرام کے سوا اور کوئی چیز سننی جرم ہے۔

یہ لاہور ہے!

دہلی نہیں! دہی دلی جہاں سے کوئی مہینا ایک سے ہندوستانی گانے کا پروگرام ایسا پر لطف براڈکاسٹ ہو رہا ہے کہ بس خداوندان براڈکاسٹنگ کی عقل پر رونا تو کیا ہنسی ضرور آجاتی ہے یا ممکن ہے جو ہماری ہی سمجھ کی غلطی ہو جو ہم اسے

"شدھ گانوں" کی قدر نہیں سمجھتے۔ بہر کیف اتنی بات کے قائل تو اب ہم بھی ہیں کہ ع

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا

لیکن ابھی کچھ روز آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ ہاں! وہ وقت دور نہیں جب آپ "شدھ گانوں" کے ساتھ ساتھ گھر بیٹھے "دھارمک ناچ" بھی دیکھ لیا کریں گے یعنی ع

سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

آداب عرض

نواب ہم بھی بنے تھے

نواب ہم بھی بنے تھے

واقعہ عرض ہے۔ کہ ایک روز ہم لاہور کے مشہور کنفکشنر ملک وبنا صاحب کے دار الکیک "پیسٹری" واقع نیلا گنبد لاہور کے پاس کھڑے تھے کہ سامنے سے نمازی صاحب کہیں سے بغل میں کچھ کاغذ اسطرح دبائے ہماری طرف چلے آرہے تھے۔ جیسے کوئی کسی کی مرغی اٹھائے لئے جا رہا ہو۔ آپ نے پاس پہنچکر پہلے تو ہمیں کچھ انداز سے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ جیسے "سی۔آئی۔ڈی" والے کسی مفرور ملزم کو دیکھا کرتے ہیں۔ پھر یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ ہاں! ہم ہی تو ہیں۔

آپ نے مسکرا کر ہم سے ہاتھ ملایا۔

"کہاں سے آئے آپ؟" ہم نے پوچھا۔

"بس آ ہی رہا ہوں" جواب ملا۔

"دفتر نیرنگ خیال سے آتے ہونگے؟

"اس سے تو میں علیحدہ ہو چکا۔" کہتے ہوئے آپ نے کوٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے فرمانے لگے۔

"دیکھئے! میں نے آپ کا نام بھی لکھ رکھا ہے"۔

ہم نے جانا ہو نہ ہو غازی صاحب نے ہمیں "ٹی" پر مدعو کیا ہوگا اور ملک دینا کے یہاں "ٹی پارٹی" کی ٹھہری ہے

کاغذ پر جہاں ہمارا نام لکھا تھا غازی صاحب انگلی رکھ کر بولے۔

دیکھ لیجئے! ہے نا آپ کا ہی نام؟"

"شکریہ!" ہم نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر کب حاضر ہوں؟" غازی صاحب نے پوچھا

"میں خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔"

یہ سنکر غازی صاحب نے پہلے تو کچھ ہماری طرف تعجب سے دیکھا پھر مسکرا کر فرمانے لگے۔

"لیکن مجھے تو مضمون چاہیئے۔"

تو جناب اسے کہتے ہیں۔ ناکردہ گناہ میں پکڑے جانا۔ ہم تو وہاں ایک دوست کے انتظار میں کھڑے تھے۔ کہ وہ آجائیں تو چلائے پیئں۔ اور یہاں "کھڑے کھڑائے" (یہ بیٹھے بٹھائے کی دوسری ترکیب ہے جس پر ہمارے لکھنوی مہربان الجھا کرتے ہیں) ایک مضمون کا تقاضا شروع ہو گیا۔

تو خیر! مضمون تو جائے بھاڑ میں۔ لیکن آپ ایک بات ضرور یاد رکھئے! ایک تو یہ کہ ملک دنیا "کن فکاشنر" کی دوکان پہ کبھی مت جائے گا۔ کیونکہ "ادبی قسم کے کیڑے مکوڑے" آپ کو یہاں ضرور جمپٹ جائینگے۔ پھر جان چھڑانا مشکل ہوگا۔

غازی صاحب کے پرچے کا نام ہے "نواب صاحب"۔ اور اسے محض اتفاق ہی سمجھئے۔ کہ ہم بھی ایک بار نواب بنے تھے۔

بات یوں ہوئی کہ ہم ہرن کے شکار کے لئے کہیں سونی پت جا نکلے۔ ہمارے تانگے والا واحد العین ہونے کے علاوہ پہلے درجے کا چھٹا ہوا۔ بھلا مانس سا آدمی تھا سردی کا موسم تھا اور کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ اور "چشم آفتاب کا یہ حال کہ نیم دروں نیم بروں"۔ ہم چاہتے تھے کہ منزل پر جلد پہنچ جائیں۔ اس لئے گا ہے گا ہے تانگے والے کو ذرا ڈھانٹ ڈپٹ بھی دیتے۔

"ابے چل! ہانک جلدی"

وہ کم بخت جواب دیتا

"اجی جناب صاحب! ابھی پہنچتے ہیں"۔

توجناب ! اس ابھی پہنچنے پہنچنے میں شفق کی لالی کائنات پر اس طرح سنہری چادر پھیلانے لگی جس طرح کسی تنگ دل عاشق کا خون جو کسی ہرجائی محبوبہ کی بے جا فیاضیوں سے تنگ آکر خودکشی کرلے۔ کمرے کی چٹائی کو قالین نما بنا دیتا ہے۔

گھوڑا وہی پرانی ٹکے چال چل رہا تھا۔ نیشکر کے کھیت کے پاس ایک کالا ہرن نظر آیا۔

شکاری بولا۔

"حضور! وہ کالا کھڑا ہے۔ دیجئے نا ایک سالے کو"۔

ہم نے تانگہ رکوایا اور رائفل سنبھال کر زمین پر بیٹھ گئے۔ اب جانے ہماری عینک کا قصور تھا یا منزل پہ پہنچنے کی افراتفری سی تھی کہ نشانہ چوک گیا۔

شکاری بولا۔

"سالے کی موت نہیں آئی تھی۔ بچ ہی گیا"

یہ سنکر تانگے والا بولا۔

اجی! نواب صاحب جو ہوئے۔ مارا مارا نہ مارا نہ سہی!"

یہ سنکر ہمیں ہنسی آگئی۔

جب منزل پر پہنچے تو پنسال نویس کی کوٹھڑی میں قیام ہوا۔ جو اس وقت قسمت سے خالی مل گئی۔ لیکن اب سوال یہ تھا۔ کہ کھائینگے کیا۔ رات ہو چکی تھی اور گاؤں کوئی دو پونے دو میل تھا۔ بہرکیف شکاری کو بھیجا کہ جو کچھ ملے لے آئے وہ کم بخت آیا بھی تو پہر رات گئے۔ ہم اس وقت کچھ سوتے تھے کچھ جاگتے تھے کہ باہر سے "کھس پھس" کی آواز آنے لگی۔ شکاری تانگے والے سے کہہ رہا تھا۔

"مسور کی دال اور چپاتیاں ملی ہیں"۔

تانگے والا بولا

"تو بس ٹھیک ہے۔ پنجاب کے نواب ہی تو ہیں۔ دال ہی کھا لیں گے"۔

یہ سنکر ہمیں ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ لیکن مناسب یہی سمجھا کہ اپنے آپ کو سوتا ہوا ظاہر کریں۔ گو آنتیں کسی عابد شب زندہ دار کیطرح قل ہو اللہ کا ورد ہی کرتی رہیں۔

شیخ چلی کا مقبرہ

شیخ چلی کا مقبرہ

ایک ہوٹل میں پانچ سات خوش فکرے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا۔ ایک بوڑھا خادم خدمت کے لئے پاس کھڑا تھا۔

کھیلنے والوں میں سے ایک بولا

"لو بھیا! ہم تو اب چلتے ہیں!"

"کہاں جاؤ گے تم؟" سامنے والے نے پوچھا۔

"گھر جاؤں گا!" پہلے نے جواب دیا۔

"اجی بیٹھ جاؤ"۔ دوسرے نے کہا۔ "کہیں دور تو جانا نہیں"۔

"بہت دور جانا ہے بھیّا!" پہلے نے جواب دیا۔

"آخر رہتے تو شہر میں ہی ہو"۔ دوسرے نے کہا۔ "ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ایک آدھ بازی تو اور کھیلو!"

"رہنا تو شہر ہی میں ہوں" پہلے نے کہا۔ "لیکن فاصلہ بہت ہے۔"

"کہاں ہے مکان آپ کا؟"

" وہیں!" پہلے نے جواب دیا۔ "جہاں کبھی شیخ چلی کا مقبرہ ہوا کرتا تھا۔
"شیخ چلی کا مقبرہ!" دوسرا بولا۔ "وہ تو کہیں چنگڑ محلے کے قرب وجوار میں تھا"
"غضب کرتے ہو مرے یار!" پہلا ہنسکر بولا۔ "کہیں عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی تمہاری؟"

"تو کیا غلط کہا ہم نے؟"

" بالکل غلط!" پہلے نے پھر مسکرا کر کہا۔ "کہاں چنگڑ محلہ اور کہاں شیخ چلی کا مقبرہ!

"تو تم ہی بتلا دو نا؟" دوسرے نے پوچھا

"شیخ چلی کا مقبرہ تو جہاں اب مصری شاہ کا محلہ ہے وہاں تھا۔ اور وہیں ہم نے بھی مکان لے رکھا ہے"۔

یہ سُنکر ایک اور بولا۔

" بھئی! تم دونوں ہی احمق ہو۔ شیخ چلی کا مقبرہ تو وہ لنڈے بازار کے جنوبی کونے میں سرائے کے پاس تھا۔ ڈھیری تو شاید اب بھی موجود ہے۔"

اس پر ایک چوتھا آدمی قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

"تم سب ہی گدھے ہو۔ شیخ چلی کا مقبرہ تو موج دریا کے پاس تھا۔ تم بھی خوب شہر میں رہتے ہو۔ اتنا بھی معلوم نہیں بس گیدی ہو پورے"۔

"محض بکتے ہو تم" پہلا ذرا غصے سے بولا۔

"زبان کو لگام دو بھیا"! اس نے بھی ذرا اکڑ کر جواب دیا

اس پر دوسرا کہنے لگا۔

"خوب! یہ چودھویں صدی کے لقمان بھی دیکھ لیجیے"!

"ہم تو لقمان نہیں"۔ اس نے گرم ہو کر جواب دیا۔ "لیکن تم لقمان زادے ضرور ہو"!

"لقمان زادہ ہو گا تمہارا باپ"! دوسرے نے گھونسہ تان کر جواب دیا

بس اب کیا تھا دونوں طرف سے خوب گھونسہ بازی اور لپاڈگی ہوئی۔

بازار میں خاصی بھیڑ ہو گئی۔ اسی اثنا میں ایک سپاہی بھی آنمودار ہوا۔ سپاہی کو دیکھ کر سب اپنی اپنی پگڑیاں سنبھالتے دروازے کی طرف بھاگے۔ سپاہی نے ایک کو پکڑ لیا۔ لیکن اس نے اس زور سے گھونسہ مارا کہ سپاہی لڑکھڑا کر گرا۔ اور مارنے والا بھاگ گیا۔ اور کسی کے ہاتھ نہ آیا۔

ملزم تو خیر بھاگ گیا۔ لیکن پولیس نے دو ایک اور آدمیوں کا جو ہوٹل میں موجود تھے چالان کر دیا۔ ملزموں کی طرف سے ایک نوجوان وکیل عدالت میں مقدمہ کی پیروی کے لئے پیش ہوا۔

گواہوں میں ہوٹل کا وہی بوڑھا ملازم بھی تھا۔ وکیل نے پوچھا۔

"شراب بھی تم ہی لائے تھے۔؟"

"شراب تو ہوٹل میں فروخت ہی نہیں ہوتی"۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

"تو کچھ لین دین پر جھگڑا ہوا ہوگا"؟ وکیل نے پھر پوچھا۔

"اجی نہیں"! بوڑھا بولا۔ "محض ایک بیکار سی بات تھی۔

"کیا؟ وکیل نے پوچھا۔

بوڑھے نے شیخ چلی کے مقبرہ پر جھگڑے ہونے کا سب قصّہ کہہ سنایا۔

مجسٹریٹ نے مسکرا کر وکیل کی طرف دیکھا اور کہا۔

"خوب! بڑے ہی احمق تھے یہ سب۔ شیخ چلی کا مقبرہ تو بھاٹی دروازے میں اونچی مسجد کے عقب میں تھا"۔

یہ سُنکر وکیل نے ذرا تعجب سے مجسٹریٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اجی نہیں! شیخ چلی کا مقبرہ تو جہاں اب رام گلی ہے یہاں کہیں ہوا کرتا تھا

"کس سے سُنا آپ نے؟" مجسٹریٹ نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"بزرگوں سے!" وکیل نے جواب دیا۔

"آپ کیا لاہور کے ہی رہنے والے ہیں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"نہیں جناب!" وکیل بولا۔" میں لاہور کا رہنے والا تو نہیں۔ لیکن تعلیم لاہور میں ہی حاصل کی ہے"۔

"بس خاموش رہیئے!" مجسٹریٹ نے کہا۔" آپ عدالت کی توہین کرتے ہیں"۔ یہ کہہ کر سب ملزموں کو سزا دے دی۔

اب سنئے! یہی وکیل صاحب ایک مالدار مہاجن کے داماد بننے کی آس لگائے بیٹھے تھے اور ایک خوش آئند زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اِن دنوں کھانڈ کے کارخانوں کا ملک میں بہت چرچا تھا۔ اور مہاجن اس فکر میں تھا۔ کہ کوئی مالدار آسامی ہتھے چڑھ جائے۔ اور وہ لمیٹڈ کمپنی بنا سکے۔ اتفاق سے شہر کا ایک ساہوکار کوئی لاکھ سوا لاکھ روپیہ دینے پر آمادہ ہو گیا۔ مہاجن نے کمپنی کے متعلق بات چیت کرنے کے لئے دس پانچ آدمیوں کو اپنے ہاں دعوت دی۔ اور اپنے ہونے والے داماد کو بھی بلوا لیا۔ جب کھانا ہو چکا۔ تو باتوں ہی باتوں میں ہوٹل

والے مقدمے کا ذکر بھی آگیا۔

"آخر بات کیا تھی؟" ساہوکار نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں!" مہاجن نے ہنسکر کہا۔ "ذرا شیخ چلی کے مقبرے پر فساد ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی سارا قصہ کہہ سُنایا۔ ساہوکار ہنسکر کہنے لگا

"حد ہوگئی۔ یہ تو شہر کے بچے بچے کو معلوم ہے کہ شیخ چلی کا مقبرہ میوہ منڈی کے پاس تھا۔ یہاں میلہ بھی لگا کرتا تھا۔"

"ہاں!" مہاجن سر ہلا کر بولا۔ "بالکل ٹھیک ہے"۔

"اجی رام رام کیجیئے!" پاس سے وکیل بول اٹھا۔ "کہاں میوہ منڈی اور کہاں شیخ چلی کا مقبرہ"۔

توکیا غلط کہا ہم نے؟ ساہوکار نے پوچھا۔

"بالکل غلط!" وکیل نے جواب دیا۔

"پاگل ہو تم! ساہوکار نے ہنسکر کہا۔

"میں تو پاگل نہیں"۔ وکیل بولا۔ لیکن آپ ضرور سٹھیا گئے ہیں"۔

بس وکیل کا کہنا تھا کہ ساہوکار کو تاؤ آگیا۔ دھوتی سنبھالتے ہوئے اٹھے

اور یہ کہتے ہوئے "رام رام! بس چل چکی یہ کمپنی جہاں بڑوں کی بات جھٹلائی جاتی ہے"
چلدیئے۔

مہاجن کو نمسکار اس طرح ہاتھ سے نکلا جاتے دیکھ کر وکیل پر بہت غصہ آیا۔
اور گرج کر بولا۔

نکل جاؤ میرے یہاں سے بدتمیز کہیں کا۔ وکیل تو بن بیٹھے لیکن بات کرنے کا شعور نہ آیا۔ اگر کل تک تم نے ساہوکار سے معافی نہ مانگی تو خبردار جو ادھر کا رخ کبھی کیا تو"

وکیل غریب چپکا وہاں سے اٹھ آیا۔ اب ایک طرف مالدار دھن سے محروم ہونے کا اندیشہ دوسری طرف رسوائی اور ندامت۔ آخر کچھ سوچ کر ساہوکار کو لکھا۔

مہاراج!

تسلیم و نیاز!

مجھے کل کے واقعہ پر بہت افسوس ہے۔ بیشک میری ہی غلطی تھی بہت نادم ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔

آپ کا نیازمند

خط بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ دن بھر خط یونہی پڑا رہا۔ اگلے روز وکیل نے خط بھیجنے سے پہلے اسے پھر پڑھا۔ اور یہ کہتے ہوئے۔

"جہنم میں جائے ساہوکار اور بھاڑ میں جائے مہاجن کی لڑکی"۔ خط پھاڑ ڈالا

شاید شیخ چلی کی روح کارفرما تھی۔



غازی



غازی

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے کرتب ہیں جن کی بدولت ایک انسان "غازی" کہلانے لگتا ہے۔ لیکن غازی مرد نہیں کیونکہ وہ تو صرف چار ٹانگوں والا ہوتا ہے اور ہمارا روئے سخن دو ٹانگوں والے حیوانِ ناطق سے ہے جس کی گوناگوں خوبیوں اور سرگرمیوں سے متاثر ہو کر حضرت اقبالؔ نے فرمایا تھا کہ ع

گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا!

لیکن کردار کی ضرورت ہی کیوں پڑے۔ جب گفتار کی یہ حالت ہو ع

؎ کہ [illegible]ے نطق نے [illegible]ے مری زباں کے لئے!

تو جناب! سچی بات بھی تو یہ ہے کہ فی زمانہ عمل تو کسی کے کوئی دیکھتا نہیں بس مقراض کی طرح جس کی زبان چلتی ہو۔ ہر قسم کی سبھا میں وہی پردھان نظر آئیگا۔ ممکن ہے کہ یہ فلسفیانہ باتیں سنکر آپ کہیں جوش میں آ کر یہ نہ کہدیں کہ ع

پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی اگر سمجھے تو کیا سمجھے!

تو جناب! اگر واقعی آپ کی سمجھ ایسی ہی سنگ للاخ واقع ہوئی ہے تو پھر

ہم بھی دست بستہ اتنی عرض کرینگے کہ جاؤ بھائی ! بس تم سے خدا ہی سمجھے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ؎

انگلیاں گھس گھس گئیں وہ خامہ فرسائی ہوئی!
اور آپ کی سمجھ ایسی کہ پتھر برسیں اور پلے پھر بھی کچھ نہ پڑے

خیر اان رموز ہائے بیخودی کو تو سر لے ہے سمجھے اصل بات تو یہ ہے کہ یوں تو ہر مرد مسلمان پیدائشی غازی ہے۔ لیکن اسکی دیکھا دیکھی اب دوسروں کو بھی غازی بننے یا کہلانے کا شوق چرانے لگا ہے۔ جیسے آجکل ایک شخص پیپل کاٹ کر غازی کہلانے لگتا ہے۔ دوسرا گائے ذبح کرنیوالوں کا گھر جلا کر غازی بنتا ہے۔ تیسرا اٹھتا ہے تو مسجد کے سامنے باجا گاجا بجوا کر غازی ہو جاتا ہے۔ ایک پڑھے لکھے کو غازی بننے کا شوق چراتا ہے تو وہ مرزا غالب پر برسنا شروع کر دیتا ہے۔ ادہر قوم کے نوجوان اٹھتے ہیں۔ تو اپنے ہی بھائی بندوں کو گالیاں دے دے کر غازی بن جاتے ہیں۔ کبھی تیسرے چوتھے سال الیکشن کا میدان گرم ہوتا ہے۔ تو اللہ والے ایمان بیچکر غازی کی سند حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن جانے یہ کیا بات ہے کہ ہمارے "نو مسلم" گاباجی کو جو الیکشن میں "گھسے" ہوئے مسلمانوں کو نیچا دکھا چکے ہیں۔ قوم کی طرف سے ابھی تک غازی

کا خطاب کیوں عطا نہیں ہوا۔ ہمارے خیال میں تو بس کلال گردوں کی قلابازی کی دیر ہے۔ آج نہ سہی کل سہی۔

قدیم عربی دانوں کے نقطۂ نظر سے تو غازی شاید اسے کہتے ہونگے جو خدا اور رسول کی راہ میں غیر مسلموں سے جہاد کرے۔ مارے تو غازی کہلائے۔ مرے تو شہید کہلائے۔ لیکن زمانہ چونکہ ہمیشہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اسلئے کسی کا فرادا کی وہ پرانی طرز کی ادائیں بھی اب ہلکو نہیں گرماتیں۔ تو پچھلی باتوں کو کون پلے باندھے پھرتا ہے۔ وہ زمانہ ہو لیا۔ اس زمانے میں تو

نمازی رہے اب نہ غازی رہے!

اور جو رہے تو نئی تہذیب کے گندے انڈے۔ یعنی وہ بزرگ جو کسی انجمن کے ممبر محض اس لئے بنتے ہیں۔ کہ خبر سیکر ٹری شپ ملے یا نہ ملے۔ شریفوں کی پگڑیاں تو اچھالا کرینگے۔ کیونکہ کسی کے منہ آنا بھی تو ایک قسم کی دلاوری ہے اور اگر کوئی "دلاور" ہونے کے ساتھ ذات کا سید بھی ہو۔ تو آپ جانئے جب یہ قوم کے جوتے پہ قربان ہونے والے بزرگ کسی قومی جلسہ میں شامل ہوتے ہیں۔ تو پانچ سات عف عف کنندگان بھی ساتھ ہو لیتے ہیں۔ تاکہ یہ ارمان بھی نہ رہے۔ کہ ع

یار کے کوچے میں میرا ہمنوا کوئی نہ تھا!

توحقیقت میں اس قماش کے شریف لوگ اصلی غازی کہلانے کے مستحق ہیں جو دوسرے کے سر پر کب رہنے دیں گے۔ جو اپنی پہلے اتار بیٹھے ہیں۔ اب خدا لگتی کہیئے۔ کہ بھلا اس سے زیادہ "غازی پن اور کیا ہوگا۔ انہی مومن لوگوں کے بل بوتے تو ابلیس نے بھی اللہ میاں کے حضور میں یہ ڈینگ ماری تھی۔ کہ جو میں بھی تیرے بندوں کی راہ نہ ماروں تو پھر میرا نام بھی ابلیس نہیں۔ کند ہمجنس با ہمجنس پرواز اسی کو تو کہتے ہیں ؛

لیکن یہ غولِ بیابانی صرف گفتار کا ہی غازی ہے۔ ہمارے غازی صاحب کی طرح اگر کردار کا بھی غازی ہو تو ہم جانیں۔

اس زمانے میں جب ملک اور قوم اقتصادی مشکلات میں اوندھے منہ پڑی ہے اور لوگوں کو جان کے لالے تو کیا، لیکن روٹی کے لالے ضرور پڑے ہیں۔

غازی صاحب کا بیٹھے بیٹھے یک قالب دو جان ہو جانا۔ بڑی ہی قابلیت اور پرلے درجے کی بہادری ہے اور چونکہ آجکل ایک دنیا پر تثلیث والوں کی حکمرانی ہے اس لئے کیا عجب کہ اس سنت کلیسائی کی یاد میں ہمارے غازی صاحب دو سے تین بھی ہو جائیں اور گھر میں ہی تثلیث کا مسئلہ ہو جائے۔ اور اگر غازی صاحب سے پوچھے کہ کیوں جناب! یہ مشغلہ آپ کیا لے بیٹھے، تو وہ بڑی معصومانہ شکل بنا کر جواب دینگے

کہ بھائی! نواب صاحب کی ناز برداریاں مجھ اکیلے سے اٹھنی محال تھیں۔ اس لئے ایک نائٹ سیکرٹری اپنے عملہ میں شامل کر لیا ہے۔ گھر کا کام دھندا بھی ہوتا رہیگا۔ اور ہمارا مطلب بھی نکل جایا کریگا۔ یعنی ایک پنتھ دو کاج والی بات ہے اور جو یقین نہ ہو تو قسم لے لیجئے۔ کہ ع

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

لہٰذا ثابت ہؤا کہ اس زمانے میں غازی صرف وہی ہے جو جورو کا جوا گلے میں ڈال کر "کمر کس" لے اور دعوت احباب کر ڈالے۔



ے مرحوم ہو چکے

قلابازیاں

قلابازیاں

سنا کرتے تھے کہ قلابازیاں یا تو اکروبیٹ لگایا کرتے ہیں یا جناب ڈاروِن کے جد امجد یعنی وہی ہنومان جی مہاراج جو مہاشہ سدرشن کے نزدیک اس قدر پوتر واقع ہوئے ہیں کہ کسی کلمہ گو کے منہ سے بن مانس دیوتا کا نام سنکر بھی آپ کپڑوں سے باہر ہونے لگتے ہیں۔ اور ایسی ایسی قلمی قلابازیاں لگانی شروع کر دیتے ہیں کہ گھر والوں کو آپ کے دماغ کے توازن پر شک ہونے لگتا ہے۔

جس طرح بھنگڑ خانے میں کبھی کبھی محض دل لگی کے طور پر ذرا جوتا چل جایا کرتا ہے۔ اسی طرح آجکل بھارت ماتا میں آناً فاناً ہر بات کا فیشن چل جاتا ہے اور پھر اس فیشن کے دلدادہ جو مزے مزے کی قلابازیاں لگاتے ہیں وہ بھی "بمبئی کے آم" سے کم مزے کی نہیں ہوا کرتیں۔ لیکن جس شخص کی طبیعت میں حسد کا مادہ ہو اسکی قلابازیوں کا تار تو کبھی ٹوٹنے میں آتا ہی نہیں اور چونکہ بدقسمتی سے ہم ذرا مضمون نگار کہلاتے ہیں اس لئے کبھی کبھی مزے میں آکر ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں کہ اکثر "پیارے" گلے کا ہار ہو جاتے ہیں۔ دور کیوں جائیے! ابھی کل کی ہی تو بات ہے کہ ہم نے

"حکیم جی کا چھلا" لکھ کر اکثر "حکیموں" کے دل میں ہل چل ڈالدی تھی لیکن نہ جانے حکیم نیرنگ خیال ہم سے کیوں ناراض ہو گئے؟ اور ملک کے طول بلد میں گھوم گھوم کر شکایتوں کے دفتر کھولنے شروع کر دئے ہیں۔ حالانکہ ہم نے تو محض اپنے حکیم یار خاں کے چھلے کی داد دی تھی۔ گو یہ معلوم تھا کہ ع

کھلیں گے شکوں کے آج دفتر ادھر ہمارے ادھر تمہارے!

حکیم جی کے دفتر تو کئی بار کھل کھل کر بند بھی ہو چکے لیکن ہم نے خیریت اسی میں سمجھی کہ اپنے دفتر میں تعطیل ہی رہے۔

لیجئے اب ایک ادبیانہ قلابازی عرض کرتے ہیں۔

ہمارے ایک نہایت عزیز دوست نے جو ہندوستان بھر میں جو دھپوری دوپٹہ کی طرح مشہور ہیں۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے یہ فتوا دے دیا کہ اسلام علیہ السلام عورت کو ٹھمک ٹھمک کر ناچنے اور بتا بتا کر گانے سے منع نہیں کرتا اب یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ کبھی ایسا جانگداز حادثہ اسلام غریب پر گذرا بھی یا نہیں لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ ہمارے حضرت مولوی جی کا فتویٰ ہے بہت مزے کی چیز اور خدا کی قسم لطف تو اس روز آئیگا جب کوئی "آنسہ بی" عرف مس صاحبہ

ایک بغل میں کتابیں اور دوسری میں ستار یا سارنگی طبلہ یا ڈھولک دبائے مدرسہ جاری ہونگی اور محلے محلے سے طبلے کی دلنواز اور سارنگی کے جانگداز نغموں کے ساتھ کسی "پرائیویٹ شریف زادی" کی میٹھی اور سریلی اور قیامت کے فتنے پیدا کرنے والی گنگھرو کی جھنکار سنائی دینے لگے اور لوگ تالیاں بجا بجا کر کہا کرینگے "ہپ ہپ ہُرّے" لیجیئے! جی

سیکھ لی قوم نے فلاح کی راہ!

لیکن افسوس! یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ رقص و سرود کی تعلیم کا انتظام کیا ہو گا آیا کوئی کوٹھے والی "ہیڈ مسٹریس" "میوزک ٹیچر" مقرر ہو گی یا لیڈروں کی طرح ہر شہر میں ڈومنیاں۔ قوال اور کتھک بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کرتے پھرا کرینگے۔

ایک اور سیاسی قلابازی ملاحظہ ہو۔

اچھوت بھائیوں کی جو آئے دن ان مہا سبھائیوں اور کانگریسیوں کے ہاتھوں گت بنتی ہے وہ تو کوئی چھپی ہوئی بات نہیں اس کے ساتھ

سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے کہ اگر کہیں ہندوؤں کو سوراج مل گیا تو پھر ہریجنوں کا کیا حشر ہوگا لیکن سوراج دینا جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ تو اس اصول کے لوگ ہیں کہ اگر کوئی تیرے ایک گال پر دھپڑ مارے تو تو دوسرا بھی آگے کر دے۔ انہوں نے از کبھی جسم کھا کر تبرکاً کچھ دے بھی دیا۔ تو ظاہر ہے کہ اچھوت بھی خالی نہ رہینگے۔ لیکن مہاتماجی کو جن کے زہد و تقوٰے میں اگر کچھ شک ہوگا تو کسی کافر کو ہی ہوگا۔ اپنے چرخہ کی چرخ چوں سنتے سنتے جو ذرا اونگھ آ گئی تو آپ کو سپنے میں منوجی نے درشن دئے اور کہا کہ گاندھی جی! ذرا جاتی کی خبر لو کس نیند سوتے ہو۔ اب جاگو۔ اچھوت الگ ہوئے جاتے ہیں۔

مہاتماجی رام رام کہتے ہوئے ہوشیار ہو بیٹھے اور سوچنے لگے کہ اگر یہ آٹھ کروڑ اچھوت ہم سے الگ ہو گئے تو پھر تو ہم کہیں کے نہ رہے۔ یہ مسلے اقلیت میں ہوتے ہوئے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ اگر انکی کہیں اکثریت ہو گئی تو پھر بھارت ماتا کا کیا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی گاندھی جی نے ناؤ میں آکر اعلان کر دیا کہ جب تک ہندو چھوت چھات چھوڑ کر اچھوتوں کو گلے لگا کر "تو میرا بھیا میں تیرا بھیا" نہ کہینگے ہم "برت" رکھیں گے اور صرف بکری کا دودھ پیا کرینگے اور کلکتے کے کیلے کھایا کرینگے"۔

توجناب اس خوفناک دھمکی کا یہ اثر ہؤا کہ بھارت ماتا کے بڑے بڑے سپوت گنگا جلی ہاتھ میں پکڑے اور قدم قدم پر پرنام کرتے اچھوتوں کے پاس گئے اور چرنوں کو ہاتھ لگا لگا کر کہا کہ بھا ئیو! مان جاؤ! رام کے نام مان جاؤ! اگر منوجی مہاراج زندہ ہوتے تو ہم ضرور ترمیم کا ریزولیوشن پیش کر دیتے دیکھو اگر مہاتماجی ٹھنڈے ہو گئے تو سمجھ لو کہ سول نافرمانی کی تحریک بھی ٹھنڈی پڑ جائیگی اور ہندو جاتی کے لئے "کوئی تبرت" رکھنے والا بھی باقی نہ رہیگا۔ اور پھر تم تو ہمارے بھائی ہو اور ہم آپ کے داس چرنی" کبھی انگلیوں سے ناخن بھی جدا ہوا کرتے ہیں۔ غریب بھرے میں آگئے۔ اودھر جب آپ کے داس چرنیوں نے دیکھا۔ کہ بگڑی بن گئی ہے تو جھٹ دیدے

صاف آنکھیں پھیر لیں۔ طلب نکل جانے کے بعد!

لیکن یہ لوگ بھی تو سوچتے ہیں کریں بھی تو کیا کریں ان لوگوں کے سر پر تو منو کا دھرم شاستر سوار ہے اور الف لیلیٰ کے "تسمہ پا" کی طرح گلا گھونٹ گھونٹ دیتا ہے۔

اب ایک مہاتمائی قلابازی دیکھئے:

ہمارے ہندی ہندوستانی مہاتما نے جب دیکھا کہ ہندو مسلم فسادتو

اب بچوں کا کھیل بن گیا ہے تو انہوں نے چپکے سے زبان کا شاخسانہ نکال کھڑا کیا اور اس نئے فتنہ کی وجہ یہ ہوئی کہ اکثر پوجاری "مہاتمائی" چھوڑ کر آپ کو دیوتا بن جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ تو جناب! جب جاتی والوں کی نگاہ میں آپ کی سیاسی سرگرمیاں بازئ طفلانہ بن کر رہ گئیں تو آپ نے کسی پر اپنے "گھلوٹنے" کی طرح چپکے سے ایک ایسا داؤ مارا کہ لوگ پھر آپ کی استادی کے قائل ہو گئے اور یہ داؤ تھا اردو ہندی کا جھگڑا۔ اور آج آپ دیکھ لیجئے کہ یہ آگ کس تیزی کے ساتھ ملک میں پھیل رہی ہے۔ نہ جانے اردو کے نام سے ہمارے لالے بھائی کیوں بد کتے ہیں۔ ادھر مہاتما کی جو مت طراز طبیعت ہے جو ماش کی دال کی طرح "لیس پر لیس" چھوڑے چلی جاتی ہے اور زبان کا مسئلہ اس قدر الجھ گیا ہے کہ اب بھگوان کی دیا سے کسی روز لاٹھی چلنے کی امید بندھنے لگی ہے۔ تو جناب اسے کہتے ہی مہاتمائی قلابازی؛

اب ایک مذہبی قلابازی بھی ملاحظہ ہو۔

اصل واقع تو ہمیں یاد نہیں لیکن یہ واقع ضرور ہے کہ کسی ادبی رسالے میں یہ بحث چھڑی تھی۔ کہ زمانہ جاہلیت کے عرب حقیقت میں "ہندو" تھے۔ ہوتے

ہوتے اس بحث نے کج بحثی کی صورت اختیار کر لی۔ دونوں جانب سے منطق۔ دلیل اور واقعات پیش ہوئے اور آخر فیصلہ یہ ہوا کہ "عرب" کسی زمانے میں بھی "ہندو" نہیں تھے۔ لیکن مہاشہ سدرشن کو جانی کے خلاف یہ فیصلہ سن کر بے حد تاؤ آیا آپ چوکے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور پیشانی پر سیندور کا ٹیکہ لگا کر جھٹ ایک مضمون بگھار ڈالا کہ ہیں یہ کیا غضب ہے زمانہ جاہلیت میں تو عرب چور بھی تھے ڈاکو بھی تھے۔ قمار باز بھی تھے۔ شراب خور بھی تھے۔ ظالم بھی تھے۔ جھوٹے بھی تھے۔ جاہل بھی تھے اور بت پرست بھی تھے لیکن ذرا مسلمانوں کا مذہبی تعصّب دیکھئے کہ ان سب باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اگر کوئی ان سے یہ کہدے کہ وہ "ہندو" بھی تھے تو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تو جناب! اسے کہتے ہیں مذہبی قلابازی!!

اب ایک نیاز مندانہ قلابازی سنیئے!

ہمارے چند ایک قدردان جو علم و فضل کی رُو سے ہم سے کہیں زیادہ بلند ہیں ہم سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بھئی! تمہاری فلاں کتاب پر تو ہم دیباچہ لکھیں گے جب تیار ہو جائے تو ہمیں ضرور خبر کیجیئو۔ ان قدردانوں میں خصوصیت سے ایک بزرگ جو علاوہ بہت لکھے پڑھے ہونے کے سولہ آنے ادیب بھی ہیں۔

شومئی قسمت سے انہیں ہماری نیازمندی کا دعوٰے بھی ہے اور وہ بھی غالباً اس لئے کہ

عروج میں بھی تواضع کا کچھ خیال رہے
وہی بلند ہوا جو نیازمند ہوا۔

لیکن آپ یقین جانیئے! کہ ہم انکی نیازمندی کے نہ تب قائل تھے اور نہ اب اور جو حشر تک بھی نہ ہوں تو انہیں کچھ تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ تو خیر! آپ نے ہماری درخواست پر ہماری دو ایک کتابوں پر دیباچہ تو لکھدیا۔ لیکن یہ شکوہ آپ کو ضرور رہا کہ ہم نے مرزا جی یا تفسیرِ حیات پر دیباچہ ان سے نہیں لکھوایا۔ مرزا جی کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ڈاکٹر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے لکھا تھا۔ احسانمند تو ہم انکے تب بھی تھے اور اب بھی ہیں لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ڈاکٹر صاحب نے جو اس وقت محض پروفیسر صاحب تھے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ کیوں ہمارے سر تھوپ دیا۔ پھر لطف یہ کہ ہمیں یہ ترجمہ بطور دیباچہ عنایت فرمانے سے پیشتر رسالہ "نیرنگ خیال" میں "فلسفہ خنداں" کے نام سے شائع بھی کروا دیا۔ غالباً اس سے "انجان" لوگوں کو یہ بتلانا مقصود ہوگا کہ آپ نے مرزا جی کے لئے دیباچہ نہیں لکھا بلکہ ہم نے نیرنگِ خیال سے نقل کر کے بطور دیباچہ اسے کتاب میں شامل کر لیا۔ حالانکہ اس مضمون میں ہمارے کردار کے متعلق ڈاکٹر محمد دین صاحب نے ایک حرف بھی نہ لکھا تھا۔

رہا یہ سوال کہ ہم نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے اسے کتاب میں بطور دیباچہ شامل کیوں کر لیا تو بہتر یہی ہے کہ ؏

بات رہے یہ راز نہیں !

ہاں اگر آپ اسے ڈاکٹرانہ قلابازی کہہ لیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا! واللہ اعلم بالصواب!

تو خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب جب مرزاجی کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع تھا تو ہم نے اپنے جناب نیازمند صاحب سے عرض کیا کہ لیجئے حضرت! مرزاجی کا دیباچہ لکھ دیجئے! آپ نے فوراً حامی بھر لی۔ لیکن کچھ روز بعد آپ کا ایک گرامی نامہ ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ مرزاجی پر تو میں دیباچہ نہیں لکھ سکا۔ ہاں "کارزارِ حیات" پر دیباچہ ضرور لکھوں گا۔ میرے لئے کم از کم آٹھ صفحے محفوظ رکھے جائیں۔

بدقسمتی سے اس وقت کارزارحیات کی جو چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے کتابت ہو رہی تھی ہم نے انکی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ دیباچہ جلد لکھ دیجئے۔ کتاب پریس میں جانیوالی ہے۔ ارشاد ہوا کہ پانچ سات روز تک لکھ دینگے۔ لیکن توبہ کیجئے وہاں تو نیازمندی کا ابال ہی اتر رہا تھا۔ کیسا دیباچہ اور کس کا وعدہ۔ تو جناب! اسے کہتے ہیں نیازمندانہ قلابازی۔

ہمارے نیازمند صاحب شاید یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ انکے دیباچہ لکھنے سے ہماری کتاب کی قدر و قیمت بڑھ جائیگی۔ حالانکہ ہے بالکل اسکے برعکس!! غالباً آپ تو سمجھ گئے ہونگے ؟

محراب

سرِ راہے

ایک روز ہم راوی پر بیٹھے ذرا ٹھنڈی ہوا سے مشام جان کو تازہ کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں ہمارے ایک دوست بھی کہیں سے آنکلے۔ اور آسن مار کر پاس ہی بیٹھ گئے اور کچھ ادھر ادھر کی بات چیت کے بعد ہولے ہولے سروں میں سے

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آب جو رہنا

الاپنے لگے۔ کچھ فاصلے پر "ہندی لالے" اشنان کر رہے تھے۔ میرا دوست کہنے لگا۔ "بھئی! یہ کیچڑ میں نہانے کا فلسفہ میں تو آج تک نہیں سمجھ سکا!"

"کیچڑ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"کیچڑ نہیں تو اور کیا؟" اس نے کہا۔ "ذرا پانی کا رنگ تو دیکھو"۔

"مرے یار!" میں نے کہا۔ "اپنی اپنی نظر۔ اپنی اپنی پسند!"

ہم اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ کہیں سے دو چار "بیبیاں" کہیں سے

آنکھیں۔ کہنے کو تو سب برقعہ پوش تھیں لیکن چہرہ برقعہ کی قید سے آزاد تھا۔

"دیکھا!" دوست بولا۔ "اُسے کہتے ہیں پردہ!"

"ٹھیک تو ہے"۔ میں نے کہا۔ "یہی تو تمہارے "حباب آب جو" کی تفسیر ہے عورتوں نے اسی سے اثر پذیر ہو کر حجاب اندر یا نقاب اندر۔ اجی وہی! "چوں گل پہ حباب اندر" بنکر رہنا ترک کر دیا ہے۔ اور پھر مذہب کی تعلیم بھی تو یہی ہے کہ خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر مت چلا کرو۔ اور یہ تمہارا برقعہ ہی تو صرف تن تن اور اکڑ اکڑ کر چلنے کا باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ برقعہ اوڑھ کر یا پہنکر اگر کوئی گردن جھکا کر چلیگا دچلیگا اس لئے کہ شعرا کے یہاں مؤنث کو مذکر ہی باندھتے ہیں) تو پیچھے سے برقع اٹھ جائیگا اور پورے ٹخنوں کے ساتھ ساق بلوریں کی بے ستری بھی ہو گی"۔

"ہوا کرے"۔ میرا دوست بولا۔

"ہوا کیوں کرے؟" میں نے کہا۔ "یہ تمہارے انگریزی داں مولویوں کے نقطۂ نظر سے صرف ٹخنے اور پنڈلیاں ہی تو زینت کے مقام ہیں۔ جنکو غیر محرم کی نظر سے چھپا کر رکھنے کا عورت کو حکم دیا گیا ہے۔ چہرہ مہرہ نہیں۔ کیونکہ چہرہ اگر کوئی چھپا رکھے تو شعرا طبع آزمائی کے لئے زمین کہاں سے لائیں"۔

"جانے تم کیا کہہ رہے ہو"۔ میرا دوست کہنے لگا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں" میں نے کہا "عورتوں نے محض خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلنے کے گناہ سے بچنے کے لیے ہی تو برقع پہنکر چلنا پھرنا چھوڑ دیا ہے رہا ٹخنوں اور پنڈلیوں کا ستر تو اسکے لئے جرابیں موجود ہیں بشرطیکہ عورت فیشن پرست نہ ہو۔ کیونکہ پند نامۂ فیشن کے نام سے جو کتاب "برو آف دی نے گڈز" کے یہاں سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جرابوں کا استعمال بھی ترک کر دو۔ کیونکہ ان کے پہننے سے سورج کی شعائیں پنڈلیوں پر اثر نہیں کرتیں اور جسم کے جس حصہ پر سورج کی شعاع نہ پڑے اسکی خوبصورتی اور نزاکت میں فرق آجاتا ہے شاید "حدیث دلبراں" بھی اسی کو کہتے ہیں"۔

"بہت خوب!" وہ سر ہلا کر کہنے لگے "لیکن اس بے پردگی کے ذمہ دار حقیقت میں ہم ہیں"

"تم ہو گے"، میں نے کہا "میں تو ہرگز نہیں۔ ہاں! خود کردہ را علاج نیست!

"علاج کیوں نہیں" وہ بولے۔

"کیا کرو گے"؟

"سیدھا"

"سیدھا کرو گے یا کھری کھری سنو گے"۔

"کیسی کھری کھری"؟

"بھئی" ! میں نے کہا "کہ میاں! کیوں آپے سے باہر ہو رہے ہو۔ تمہارا میل جوڑ یا ملاپ کچھ اور تو ہے نہیں بس ع

اک دل لگی ہے وقت گذرنے کے واسطے!

اور پھر ہم بھی تو یہی مشورہ دینگے کہ اے میرے بھائی ؎

بی بی میں جو طرز مغربی ہو تو کہو

احسان ہے یہ جو مجھکو شوہر سمجھو

وہ ہنسنے لگے۔ میں نے بھی ہنسکر کہا۔

"مرے یار! وہ دن گئے جب ؎

اس کا گھوڑا جسکی کاٹھی

بھینس اسی کی جسکی لاٹھی

ہوا کرتی تھی۔ اب اسکو غنیمت جانو کہ دونوں وقت تمہیں پکی پکائی مل جاتی ہے"

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

"دریا پر ہر روز آتے ہو" اس نے پوچھا

"ہاں!" میں نے کہا۔ "آتا تو ہر روز ہوں"۔

"کس وقت؟"

"کوئی پانچ ساڑھے پانچ بجے یہاں پہنچ جاتا ہوں"۔

"نماز بھی یہیں پڑھا کرتا ہوں"۔

"نماز؟" میں نے کہا۔ "محض اناڑی ہو تم۔ یہ تو اب اوٹ آف فیشن ہو چکی"۔

"تمہارے اور بھائی بند تو پڑھتے ہیں"۔

"بیشک!" میں نے کہا۔ "کبھی کبھی پڑھ تو میں بھی لیتا ہوں۔ لیکن جو سچ پوچھو تو ؎

مجھے کام کیا تھا نماز سے مجھے ہوش کیا تھا سجود کا
تیرے نقشِ پا کی تلاش تھی جو جھکا رہا میں نماز میں

خوش گپیاں

خوش گپیاں

آج طبیعت میں کچھ کسل سا تھا۔ ہم آنکھیں بند کئے آرام کرسی پر بیٹھے عالمِ کون و مکاں کے عجائبات اور تغیرات پر غور کر رہے تھے۔ پاس ہی تپائی پر قلم دوات اور چار پانچ کاغذ رکھے تھے۔ ایک نابکار مکھی کسی مہاسبھائی کی طرح گلے کا ہار ہو رہی تھی کبھی ناک پر سوار ہے تو کبھی پیشانی کے بوسے لے رہی ہے کبھی چندیا پر رینگ رہی ہے اور کبھی ہاتھ چاٹ رہی ہے اس کمبخت کے پیار نے کچھ اس قدر پریشان کر رکھا تھا۔ کہ ہمیں اپنے انسان ہونے پر تاؤ آرہا تھا۔ کہ کہنے تو آب و باد و خاک پر ہم اللہ میاں کے خلیفہ (حجامت بنانے والے نہیں) ہیں یعنی وہی سات قسم کی مٹی کا پتلا جس کے سامنے فرشتوں نے بھی سر جھکا دیا تھا۔ اور جس نے اپنی تخلیق کے روز ہی پہلی کرامت اور وہ بھی بسم اللہ کے طور پر یہ دکھائی کہ ایک مقرب بارگاہ کو اسکے معبود سے منحرف کروا دیا اور بیٹھے بٹھائے ایک خوفناک دشمن پیدا کر لیا۔ اور پھر باغ ارم کی سیر کرتے کرتے طبیعت جو گدگدائی تو شرماتے شرماتے اپنے اللہ میاں سے ایک محرم راز بھی مانگ لی لیکن حرفِ دل بہلانے کو یا شاید راز کی باتیں کرنے کو یعنی وہی بڑی بی جنکی صاحبزادیاں آج مجمع عام میں باغ

ارم کی پریاں تو نہ سہی لیکن اندر کے اکھاڑے کی پریاں تو ضرور بنی پھرتی ہیں۔

ہم حیران تھے کہ ہیں تو نائب السلطنت لیکن حال یہ ہے کہ ایک ہیچ مقدار مکھی نے قافیہ تنگ کر رکھا ہے اس سے بہتر تو یہ تھا کہ ایک مکڑا ہی ہوتے جو اس نابکار ایک مکھی کو کیا۔ اس جیسی سینکڑوں کو مار کر فنا کر دیتے۔ لیکن ابھی غصے کا آغاز ہی تھا کہ ہمارے ایک ملنے جلنے والے تشریف لے آئے اور ہمیں کچھ پریشان سا دیکھ کر فرمانے لگے۔

"کچھ فکر سخن ہو رہا ہے کیا؟"

اس کے جواب ہم صرف ذرا سا مسکرا دیئے۔ انہوں نے پھر پوچھا۔

"کیا لکھ رہے تھے۔ کچھ ہمیں سنائیے گا؟"

"لکھنا کیا خاک ہے!" ہم نے جواب دیا "ایک مکھی کمبخت نے اسوقت تو پریشان کر رکھا ہے"۔

"مکھی؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا "سچ؟"

"جی ہاں" ہم نے اس ہاں کو ذرا لانبا کر کے کہا "مکھی! کبھی دیکھی بھی آپ نے؟"

"تو گویا مکھی پر کچھ طبع آزمائی ہو رہی ہے"۔

ہم نے کہا۔

"مرے یار! جب آپ جیسے موٹے موٹے ملڑے موجود ہوں تو ہمیں کیا پڑی کہ ہم مکھی پر کچھ لکھیں"

وہ ہنسکر کہنے لگے۔

"بھئی! کئی بار تم سے یہ پوچھنے کو جی چاہا کہ تم مضمون لکھتے کیسے ہو"۔

"تم کہو تو ابھی لکھدیں" ہم نے کہا۔

"کس موضوع پر؟" انہوں نے ہنسکر پوچھا۔

"آپ پر!" ہم نے کہا۔ "کیا صلاح ہے آپ کی؟"

وہ ہنسنے لگے۔ ہم بھی ہنسنے لگے۔ لیکن محض بناوٹی ہنسی۔

"بے خود بخود کیوں ہنسنے لگے تم؟" انہوں نے پوچھا۔

"تمہاری ہیئت کذائی اور قطع وضع دیکھ کر"۔ ہم نے جواب دیا۔

"کیا نقص نظر آیا تمہیں ہماری قطع وضع میں؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

اور ہم نے بھی مسکرا کر ہی کہا۔

"تمہاری قطع وضع دیکھکر تو یہ شک ہونے لگتا ہے کہ گویا ع

"پتلون کی تکرار ہے پاجامے سے!"

"تسلیم!" وہ مسکرا کر کہنے لگے اور میری ہئیت کذائی!"

" سنئیے!" ہم نے جواب "آپ کی ہیئت کذائی دیکھ کر صرف یہ پتا چلتا ہے کہ گویا لاہور کے بڑھیوں کا نغز یہ سامنے رکھا ہے"۔

"گویا!" وہ ہنسکر کہنے لگے۔ "مجھ پر طبع آزمائی ہو رہی ہے۔ آگے ارشاد فرمائیے"

"عرض کرتا ہوں"۔ ہم نے کہا۔ "شہر بھر میں آپ کے کملات کی دھوم مچ رہی ہے"۔

"وہ کیسے؟" انہوں نے پوچھا۔

"سنئیے!" ہم نے کہا۔ "سیاست کے میدان میں آپکے شدید فلم کی" دولتیاں" دیکھ دیکھ کر گمان ہونے لگتا ہے کہ پنجاب کی وزارت عظمٰے آپ کے پاؤں چومنے کی منتظر ہے۔ لیکن جہاں آپ کے اس چکنے چپڑے منہ پر سونے چاندی کا جوتا پڑا یہ دولتیاں بھی ٹھنڈی پڑ گئیں"۔

"سمجھ گیا!" وہ ہنس کر کہنے لگے "کسی کی سیاسی سرگرمیوں پر تنقید ہو رہی ہے"

"آپ سنئے جائیے!" ہم نے کہا۔ "آپ کی سیاسی قلابازیوں اور اسکے ساتھ "اسلامی حمیت" نے ایک دنیا کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ آج کل آپ کی مجاہدانہ سرگرمیاں قوم فروشی کے بلند مقامات پر پہنچ چکی ہے۔ اسلامی معاملات میں آپ کی

دلچسپیاں اور مجاہدانہ کوششیں دیکھ دیکھ کر بیساختہ زبان سے نکل جاتا ہے کہ ؏

خدا محافظ ہے کارواں کا اگر یہی رہزنی رہیگی!"

افتراق کی آپ اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جس کے آگے ذلت اور تباہی ڈیرا لگائے بیٹھی ہے ایک طرف آپ کسی فراق کے مارے پپیہے کی طرح "قوم قوم" پکار رہے ہیں۔ کوئی آپ کو لیڈر تسلیم کرے یا نہ کرے۔ لیکن آپ ہیں کہ قوم کے غم میں گھلے جا رہے ہیں اور لیڈر۔ی کا ٹیکہ ماتھے پر لگانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ "جوتے پڑیں یا گو بیک کے نعرے لگیں یا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال ہو۔ لیکن آپ ہیں کہ شمشیر براں کی جھلک اور جھنکار سن کر بھی ؏

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے!

کہتے ہوئے قوم کے نام پر جہاں سے جو کچھ بھی ملے سمیٹے چلے جاتے ہیں اور جو کوئی آپ سے حساب پوچھ بیٹھے تو آپ مسکرا کر صرف یہ جواب دیتے ہیں کہ ؏

حساب دوستاں در دِل!

ایک وہ وقت تھا کہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے آپ نے جبل کو خالہ جی

کا گھر سمجھ رکھا تھا۔ اور آج یہ حالت ہے کہ جو لوگ ناموس اسلام کی خاطر جان قربان کرتے ہیں۔ آپ ان پر آوازے کستے ہیں۔ لیکن ..... ”

ہمارے مہربان جو خاموش بیٹھے سن رہے تھے بات کاٹ کر بولے۔

لیکن یہ تو بہت خشک موضوع تم لے بیٹھے!“

”تو جانے دیجئے!“ ہم نے کہا ”ہاں! کبھی آپ نے جدید ہندوستانی کا نمونہ بھی دیکھا سنا؟“

”ہندی ہندوستانی کہئے!“ وہ کہنے لگے۔

”نہیں!“ ہم نے کہا۔ ”ہندی ہندوستانی کا لفظ تو گاندھی نے اپنی مادری زبان کے لئے تراش لیا ہے۔ لیکن جدید ہندوستانی سے ہمارا مطلب ہندوستان کے ”لالاؤں“ کی زبان ہے“۔

”بھئی!“ وہ بولے۔ ”یہ ریڈیو کا پروگرام جو دہلی سے شائع ہوتا ہے اس میں بھی تو اردو کی بجائے ہندوستانی استعمال کیا جاتا ہے“۔

”محض اناڑی ہیں آپ بھی!“ میں نے کہا۔ ”آج ہندو کا طوطی بول رہا ہے یہ ریڈیو کے اسٹیشن ماسٹر نہ توبہ! اسٹیشن ڈائرکٹر اگر کہیں اردو لکھیں تو ایک تو روزی خطرے میں پڑتی ہے۔ دوسرے ان کی آزاد خیالی پر داغ لگتا ہے“۔

"یہ داغ لگتا کیا؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"مرے یار!" ہم نے کہا۔ "چلو تم آنا کہہ لو۔"

"سمجھ گیا"! وہ بولے "لیکن یہ تو بتلاؤ آج کل دہلی سے "شرمیتی گلانی" کیوں براڈ کاسٹ ہو رہے ہیں۔"

"بھئی!" ہم نے کہا "عجب احمق ہو تم بھی! اسے ہی تو کہتے ہیں ایک پنتھ دو کاج!"

یہ سنکر وہ خوب ہنسے۔

"خوب پتے کی کہی تم نے"۔ کہنے لگے "لیکن ایک بات اور بھی ہے"۔

"کیا؟"

"یہ ہمارے دوست جو "غزنی" سے یہاں صرف گانے کو آئے ہوئے ہیں! نہیں کیا ہو گیا ہے۔ ان کا شمار تو ہندوستان کے مشہور گانے والوں میں تھا۔ لیکن اس روز انہوں نے جس انداز سے وہ غزل گائی جس کا قافیہ ردیف ہے "ہائے توبہ"! تو ہم نے یہ جانا کہ ہو نہ ہو غزنی والوں کے پیٹ میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ کیونکہ "ہائے توبہ" جس انداز سے آپ ادا کرتے تھے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ غریب گاتے گاتے درد میں مبتلا ہو گئے ہیں"۔

"ہم نے کہا!"

"آپ یہ رموز نہیں سمجھ سکتے!"

"نہ سہی! انہوں نے مسکرا کر کہا "ہاں! وہ ذرا جدید ہندوستانی بھی سنا دیجئے"۔

"سنئے!" ہم نے کہا "کچھ دن ہوئے ہم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ میرے ہم سفر ایک لالہ جی تھے۔ لیکن وہ کچھ اس طرح خاموش بیٹھے تھے جیسے کوئی بیوی اپنے میاں سے روٹھ کر الگ جا بیٹھتی ہے۔ اور ہم دل میں کہہ رہے تھے۔ کہ دیکھئے یہ ہمارے ہندوستانی بھائی جان! حب وطن کے مارے انہیں ہمارا یہاں بیٹھنا بھی ناگوار ہو رہا ہے لیکن شاید وہ اپنے کسی "ہم جنس" کی تلاش میں تھے۔ کیونکہ گاڑی جب کسی اسٹیشن پر رکتی تو وہ جھٹ کلنگ کی طرح گردن باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ آخر ایک اسٹیشن پر بھگوان جی کی کرپا سے ان سے ملتی جلتی قطع وضع کے ایک اور لالہ جی بمعہ اپنی دھرم پتنی اور ایک عدد ننھے لالہ جی کے اسی خانے میں گھس آئے۔ اور آتے ہی "ہیلو! نمستے!" کہکر اسباب رکھوانے لگے۔ اور ان کی دہرم پتنی کوئی پونے دو ہاتھ کا گھونگھٹ نکال کر ایک نشست پر دبک کر بیٹھ گئی۔ جب یہ صاحب اپنا اسباب رکھوا کر اطمینان سے بیٹھ گئے

تو دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔

پھر پہلا ہندوستانی لالہ کہنے لگا۔

"کہئے! مزاج تو اچھے ہیں"۔

دوسرا ہندوستانی لالہ۔ "تھینک یُو۔ کرپا ہے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ۔ "کہاں جارہے ہیں آپ؟"

دوسرا ہندوستانی لالہ۔ (دھرم پتنی کی طرف دیکھ کر)

"وائف" کے دانت میں درد ہے۔ انہیں لاہور لے جا رہا ہوں"۔

پہلا ہندوستانی لالہ۔ "یہاں کوئی "ڈینٹسٹ" نہ تھا؟"

دوسرا ہندوستانی لالہ۔ "ایک دو ہیں تو سہی۔ لیکن "فادر ان لا" نہیں مانتے تھے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ۔ "کے روز کی "لیو" لی ہے؟"

دوسرا ہندوستانی لالہ۔ "چھٹی تو بہت سی "ڈیو" تھی۔ لیکن میں نے "ایک ویک" کی لی ہے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ۔ "بڑے لالہ جی "ریٹائر" ہو گئے یا ابھی "آفس" جاتے ہیں"۔

"دوسرا ہندوستانی لالہ۔ "وہ تو دیر سے "ریٹائر" ہو چکے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ:"آج کل کیا شغل ہے؟ "ٹائم" کیسے گذرتا ہے۔ کوئی "بزنس" وزنس اب وزنس خالص ہندی ہندوستانی ہے اکرتے ہونگے"۔

دوسرا ہندوستانی بولا:"وہ تو آج کل گئوشالہ "کمیٹی" کے "چیرمین" ہیں بسیوا ہی کرنی ہے نا"

اتنے میں کوئی اسٹیشن آ گیا اور اس "موسٹ ماڈرن ہندوستانی" کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے منقطع ہو گیا۔

جب گاڑی چلی تو پھر بات چیت ہونے لگی۔

دوسرا ہندوستانی لالہ:"آپ لاہور سے کب آئے تھے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ:"کوئی "ویک" ہو گیا ہے"۔

دوسرا ہندوستانی لالہ:"سنا ہے مسٹر جناح لاہور آئے ہوئے ہیں"۔

پہلا ہندوستانی لالہ:"ہاں! آئے تو ہوئے ہیں اور گورنمنٹ نے شہر میں ڈنڈا پولس بھی لگا رکھی ہے"۔

دوسرا ہندوستانی لالہ:"کہتے ہیں مسلمانوں نے "سول ڈس اوبی ڈی انس" کی دھمکی دے رکھی ہے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ ۔ "شاید مسٹر جناح صلح کا کوئی "فارمولا" تیار کر دیں"

دوسرا ہندوستانی لالہ۔ "کہتے ہیں مسٹر جناح مسلمان ہیں لیکن اُردو میں تقریر نہیں کرتے"۔

پہلا ہندوستانی لالہ۔ "آل انڈیا لیڈر جو ہوئے"۔

اتنے میں ننھے لالہ جی نے بیٹھے بیٹھے سوراج کے لئے شور مچانا شروع کر دیا۔ اور یہ دلچسپ گفتگو ناتمام رہ گئی۔ بہرکیف دو ایک باتوں کا ہمارے علم میں اضافہ ہو گیا ایک تو یہ کہ مسٹر جناح ضرور کوئی ہلاکو خاں کی قسم کے آدمی ہیں اور گورنمنٹ نے حفظ ما تقدم کے لئے شہر میں ڈنڈا پولس لگا رکھی ہے۔ دوسرے مسلمان وہ ہے جو گاندھی جی کے الفاظ میں "اردو بجایا" کرے۔ تیسرے یہ کہ جو آل انڈیا لیڈر ہو وہ اردو میں تقریر نہیں کیا کرتا۔

ہمارے مہربان فرمانے لگے۔

ہندو بھائی تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندی رائج ہو جائے۔ لیکن جانے آپس میں اس زبان میں بات چیت کیوں نہیں کرتے"۔

ہم نے کہا۔

"بھئی! بولیں تو تب جو کسی کو یہ" ہادن دستنے" سے ملتی جلتی آواز والی زبان آتی ہو"

" لیکن یہ نئی پود کے اردو لکھنے والوں سے مشکل نویسی کی شکایت تو مجھے بھی ہے"
ہمارے دوست نے کہا۔

" ٹھیک ہے!" ہم نے جواب دیا۔" آپ جانئے! ہندی اردو کا قضیہ پیدا کرنے کے حقیقت میں یہی لوگ ذمہ دار ہیں۔ ان لوگوں کے یہاں لیاقت کا معیار صرف اتنا ہی ہے کہ بقول منشی پریم چند صاحب آنجہانی "معرّب اور مفرّس" الفاظ اپنے مضامین میں ٹھونسے چلے جائیں۔

خدا کی قسم! ان لوگوں کے مضامین یہ ادق الفاظ کچھ اس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسے قومی جلسوں کی صدارت کے لئے مولوی عبدالقادر جی یا سکھ اور مسلمان کا جھگڑا چکانے کے لئے "راجہ جی" یعنی توحید پرستوں کا ثالث آذر!!

حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سلیس اردو لکھنے کی کوشش کیجائے اور یہ معرّب اور مفرّس" الفاظ اردو تحریر سے اس طرح ناپید ہوں۔ جیسے تحریک شہید گنج میں مردِ "حر" "غیب غلہ"!

" خوب!" وہ ہنس کر بولے۔" بہت خوب تمثیلات ہیں۔ لیکن زبان کے اس قضیہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہمارے خیال کو آپ رہنے دیجیئے!" ہم نے کہا "لیکن یاران وطن کے مدنظر صرف اتنی بات ہے کہ وہ آزاد خیال ہندو اور مسلمان جو آج تک کسی سیاسی جھگڑے میں شامل نہیں ہوئے بیکار نہ بیٹھیں اور اردو کے ہندو مسلم ادیبوں اور شعرا میں جو ذرا میل جول سا نظر آجاتا ہے۔ اس رنگ میں بھی بھنگ پڑ جائے۔ سو رام جی کی کرپا سے ان کی یہ آرزو بھی اب پوری ہوتی نظر آرہی ہے"۔

وہ کہنے لگے۔

"تعجب تو یہ ہے کہ ہمارے خالصہ بھائی پنجاب میں ایک اور ایک دو گیارہ فیصدی ہو کر ۳۳ فیصدی نشستوں کے لئے تو مورچہ لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن پنجاب میں گورمکھی زبان اور گورمکھی رسم الخط کے احیا کے لئے کیوں جتھے بازی نہیں کرتے"۔

"سنیئے!" ہم نے کہا "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ایک موقع پر خالصہ جی نے یہ مطالبہ کیا کہ دربار کی زبان فارسی کی بجائے گورمکھی قرار دی جائے۔ مہاراج کے دربار میں ایک مسلمان مشیر بھی تھے۔ انہیں حکم ملا کہ آپ ذرا دیکھیں تو سہی کہ فارسی کی جگہ اگر گورمکھی دفتری زبان ہو جائے تو کچھ نقص تو پیدا نہ ہوگا۔ یہ وزیر تھے بڑے باتدبیر۔ انہوں نے ایک بہت بڑے "گورمکھ" کو جسے گورمکھی زبان میں پڑھا لکھو سنگھ یعنی پڑھا ہوا سکھ کہتے ہیں۔ بلوا کر گورمکھی میں "میاں قطب الدین سلمۂ تعالےٰ" لکھنے کو کہا۔ اس نے جھٹ

لکھ کر پیش کر دیا۔ اب ایک اور گورمکھی داں کو بلوایا گیا اور اسے یہ کاغذ پڑھنے کو دیا گیا۔ اس نے کاغذ اٹھا کر دیکھا اور چپکا ہو رہا۔ مہاراج نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سناؤ۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ مہاراج! یہ تو گالیاں لکھی ہیں۔ حکم ہوا کہ پڑھو کچھ مضائقہ نہیں۔ تو جناب "میاں قطب الدین سلمہ تعالےٰ" کو اس نے یوں پڑھا۔ "میاں کتا بے دین۔ تو میرا سالا میں تیرا سالا۔"

بس سمجھ لیجئے کہ گورمکھی کے حامیوں کو کس قدر ندامت اٹھانی پڑی ہوگی۔

یہ سُن کر میرے دوست بہت ہنسے۔ پھر کہنے لگے۔

"یہ ملّانوں کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا! یہ بھی کبھی بدلینگے یا وہی پرانی لکیر پیٹے چلے جائینگے"۔

"حضرت!" ہم نے کہا۔ "یہ بدل جائیں تو مسلمانوں کے دن نہ بدل جائیں قسمت نہ جاگ اُٹھے۔

سنیئے! پٹھانکوٹ سے اس طرف ایک اسٹیشن سرنا ہے۔ یہاں نہر سے اس پار ہمارے ایک کرم فرما کی کچھ اراضیات ہیں یہ صاحب ایک پکے مسلمان اور بڑے بامروت اور با اخلاق بزرگ ہیں۔ ایک موقع پر مجھے کوئی دو پونے دو مہینے ان کا مہمان ہونا پڑا۔

چونکہ یہ صاحب خود بھی بڑے دیندار آدمی ہیں اس لئے ان کی بدولت دینداری کے جراثیم گرد و نواح میں بھی خوب پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کے یہاں جمعہ کی نماز بڑے اہتمام سے پڑھی جاتی تھی کوئی دس پندرہ میل سے ایک جیّد قسم کے "مولوی جی" امامت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ ابلق ایام کے رنگ کے ایک مریل سے ٹٹو پر سوار ہو کر آتے۔ خود بھی مشکیں رنگ کے ذرا کرڑوے سے مولوی تھے۔ طائرِ بامِ حرم کی طرح چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں تھیں جو دینداری کے گھمنڈ سے ہر وقت خمار آلود معلوم ہوتیں۔ نہایت مختصر لیکن بے حد دلچسپ خطبہ دیتے۔ بارہ اور ایک کے درمیان خطبہ شروع ہوتا اور صرف تین بجے ختم ہو جاتا ہے۔ ابتدا تو قرآن حکیم سے ہوتی اور ختم بابا گرو نانک جی مہاراج کی کسی "بانی" پر ہوتا۔ نمازی تو اکثر بیٹھے بیٹھے حوران جنت کی آغوشش کے مزے لینے لگتے۔ لیکن یہ میرا شیر پورے تین گھنٹے پڑری و دٹانگوں پر کھڑا ہو کر گرجتا رہتا۔ اور کبھی کبھی برسنے بھی لگتا۔ لیکن نمازیوں کی کشت سوکھی ہی رہتی۔ کمال دیکھئے! کہ نماز آنکھ جھپکتے ختم فرما دیتے۔ پھر دعا کا سلسلہ شروع ہوتا۔ حضور سرورِ کائنات صلعم سے لیکر اپنے اور نمازیوں کے نانا نانی اور دادا دادی اور پھر ان کے بزرگوں کی ارواح کو دعا کا ثواب پہنچایا جاتا۔ پھر خالص اپنے نفس کے لئے کچھ "مخفی" دعائیں مانگی جاتیں۔ پھر دونوں ہاتھ بازوؤں کی وسعت تک آگے بڑھا کر فرماتے:۔

اے موسیٰؑ کے خدا اور اے عیسیٰؑ کے خدا! اور
اے ابراہیمؑ کے خدا! طفیل اپنے محبوب اکرم حضرت
صلعم حضور خواجۂ دو جہاں اس اپنے گنہگار بندے
(یہاں اپنا اور اپنے باپ کا نام لیتے) کو جو تیرے
اِن پاک بندوں کی امامت کا حق ادا کرتا ہے۔ حورانِ
جنت کا قرب عطا فرما اور غلمان کی صحبت سے
مستفید کیجیو!!"

اور جناب چونکہ نمازیوں میں زیادہ تر سادہ لوح دہقان ہی ہوتے اس لئے ایک ایک لفظ پر جھوم جھوم کر آمین کی ایسی بوچھاڑ ہوتی کہ رہے نام اللہ کا!

لیکن جناب! سچ تو یہ ہے کہ ملاّ نام ہے "ظرافت اور لطافت کا"! اور خصوصیت سے ایک دہقانی ملا جو سو فیصدی اپنے آپ کو "حامیٔ دین" تصور کرتا ہے۔ اور خدمت اسلام کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ خواہ اسمیں اسے خفت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ اور پھر ایک دہقانی ملا پر ہی کچھ موقوف نہیں بڑے بڑے جیّد ملا نے بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روایت ہے کہ نواب واحد علیشاہ عرش آشیاں کے ایک

ہم وطن مولوی صاحب اگر کسی مسلمان کو انگریزی جوتا پہنے دیکھ لیتے تو ڈانٹ کر فرماتے کہ ابے! کیوں ایمان خراب کرتا ہے اپنا۔

کتنے تعجب کا مقام ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ صرف انگریزی جوتا پہننے سے ایمان خراب ہوتا دیکھ کر ایک مولوی کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی تھی۔ لیکن آج ایک مسلمان بی بی کو سولہ سنگار کئے مجمع عام میں جلوہ گر دیکھ کر کسی مولوی صاحب کے دل میں "ہوک" نہیں اٹھتی۔ رہی یہ بات کہ آپ اس لطیف لفظ "ہوک" کے معنی نہیں سمجھ سکتے تو اس میں کچھ تعجب بھی نہیں۔ کیونکہ یہ نخالص اردو ہے جس سے اردو داں حضرات کو کچھ قراقم سا ہونے لگتا ہے "ہوک" سے ہماری مراد "کسک" ہے۔ سمجھ گئے اب تو؟ ہاں بقول شخصے! ہمارے مضامین میں کہیں کہیں پنجابی الفاظ کچھ اس طرح گھسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے کانگرس پارٹی میں خال خال مسلمان ٹھنسے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔ اور بعض لطیف المزاج حضرات کو ہماری پنجابی ترکیبیں کچھ ایسی بھونڈی معلوم ہوتی ہیں جیسے اتحاد ملت والوں کو مرد "حر" کی سیاسی سرگرمیاں۔ تو اس پر تاؤ میں آنے یا تاؤ کھانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ کیونکہ اردو ہندی کا ملاپ اتنا ہی غیر ممکن ہے جتنا ہریجن اور برہمن کا ملاپ لیکن بھرت

کی طرح ہماری اردو پنجابی کا میل چونکہ ممکن معلوم ہوتا ہے اس لئے ہم دانستہ یا نادانستہ اس قسم کی ادبی غلطی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ تو جناب اگر ایک مادہ اسپ تازی اور گدھے کے "ملاپ" سے خچر ایسا کار آمد جانور یا حیوان پیدا کیا جا سکتا ہے تو کیا عجب کہ پنجابی اردو کے میل سے ایک ایسی زبان تیار ہو جائے۔ جو کم از کم شمالی ہندوستان میں ہی اس قضیہ کا استیصال کر دے ؂

اب رہے وہ لوگ جو یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ ناگری رسم الخط اور ناگری زبان ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے تو وہ غریب مسلمانوں کو تو ان کے حال پر چھوڑ دیں پہلے پنڈت جواہر لال نہرو سے پوچھ لیں کہ وہ اس معاملہ میں کیا فرماتے ہیں۔ کیونکہ کسی پرچہ نویس نے یہ خبر اڑا دی ہے کہ پنڈت صاحب اردو زبان ہی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کرتے ہیں اور جب ادھر سے تسلی ہو جائے تو پھر اب بھگوان کے لئے اتنا ہمیں بھی بتلا دیں کہ جب اچھوتوں کے گھی کا استعمال کر لینے سے آپ کے دیوتاؤں اور انکی دھرم پتنیوں کی "عزت بھرشٹ" ہوتی ہے۔ اور اس جرم کی پاداش میں ان پر لاٹھیاں اور جوتے برستے ہیں اگر یہی لوگ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط اختیار کر لینگے۔ تو کیا پھر آپ کا دھرم بھرشٹ نہ ہو گا (یا اچھوتوں

کو حکم ملیگا۔ کہ تم لوگ اردو زبان اور اردو رسم الخط اختیار کر لو!)

اور چونکہ ہوگا اور ضرور ہوگا تو پھر ہمیں اندیشہ ہے کہ بیچارے بنارسی پنڈت کو بھارت ماتا سے بن باس اختیار کرنا پڑیگا۔ اور چونکہ یہ پنڈت جی مہاراج ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی ہیں۔ اس لئے ہم انہیں مصیبت میں دیکھنا گوارہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کے جو خون آشام منظر گاہے گاہے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں یہ محض آپ ایسے مہاپرشوں کے دم قدم کی بدولت ہے۔

اتنے میں بازار کی جانب سے آواز آئی۔

"ہندو چھولے"۔

"یہ ہندو چھولے کیا بلا ہے"۔ ہمارے دوست نے پوچھا۔

ہم نے کہا "صبر کیجئیے! ابھی مسلمان کا نان کباب بھی آیا چاہتا ہے"۔

یہ سنکر وہ ہنسنے لگے۔ اور پھر کسی روز آنے کا وعدہ کر کے چلدیئے۔

بیکار باتیں

بیکار باتیں

جاڑے کے دن تھے اور ہم پلنگ پر لیٹے ؏ "ارے مجھے جاڑا لگے" گنگناتے ہوئے خیالوں کی دنیا کے مزے لے رہے تھے۔ اچانک خیال آیا کہ او ہو! ہم تو محض اناڑی ہی ہیں۔ جو آج تک دنیا کا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ حالانکہ بڑے بڑے جہاندیدہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ؏

ہے بہار باغ دنیا چند روز!!

بھلا اکیلا آدمی بھی کسی کام کا ہوتا ہے۔ اب سوچنے لگے کہ یہ مشکل حل کیسے ہو۔ یعنی کون سا طریق اختیار کریں کہ ہم ایک کے بجائے دو ہو جائیں یعنی نصف ہم اور نصف کوئی اور۔ ادبی رسائل میں تو صرف عاشق کو معشوق سے لڑا دینے والے یا معشوق کو عاشق میاں کے قدموں پر گرا دینے والے ہی اشتہار شائع ہوتے ہیں لیکن کوئی ایسا مجرب نسخہ تو آج تک کسی ادبی رسالے میں نظر سے نہیں گذرا جس سے مختلف انواع اقسام کے معشوق لوگ متلاشیان روزگار نہ توبہ متلاشیان معشوق کی طرف بہ رضا و رغبت "ہیں غافل بھی ہوں اور بالغ بھی ہوں" کہتے ہوئے کھچے چلے آئیں۔ حالانکہ بعض رسالوں کے مدیر "حکمت گری" کا ڈھونگ بھی رچائے رکھتے ہیں۔

کمرہ بالکل خالی تھا۔ صرف ہم تھے اور وہ بھی خیالوں میں کھوئے ہوئے ہاں آتشدان پر جو گھڑی رکھی تھی۔ وہ بقول ایک تازہ ادیب "چہک" رہی تھی۔ وقت تو یہی نو دس کا ہوگا لیکن یہاں خیر سے بارہ ہی بجے تھے۔ ساتھ کے کمرے میں خالہ جان بیٹھی کچھ گنگنا رہی تھیں۔ شاید عمر رفتہ کا نوحہ پڑھ رہی ہونگی۔ کیونکہ آواز میں کچھ سوز بھی تھا۔

ہم نے پوچھا

"خالہ بی! کیا کرتی ہو"

"جواب ملا۔

"بیٹھی ہوں اور کپڑا سی رہی ہوں"۔

ہم نے کہا۔

"خالہ بی! ایک وقت میں دو کام کیسے ہو سکتے ہیں؟"

خالہ ہنس کر بولیں۔

"تم تو بس پاگل ہو!"

یہ سن کر ہم سوچنے لگے کہ شاید خالہ جان نے سچ ہی کہا ہو۔ کیونکہ خالہ جان کی عمر کی عورتیں عاقبت کے خوف سے جھوٹ ذرا کم ہی بولا کرتی ہیں۔ ہم لحاف میں منہ دیکر

مسکرانے لگے۔ کیونکہ ہمیں یہ یقین آتا ہی نہ تھا کہ ہم میں بھی یہ "وصف" موجود ہے کیونکہ دنیا میں جس قدر بڑے بڑے آدمی ہو گذرے ہیں۔ چونکہ یہ سب اپنی دھن کے پکے تھے۔ اس لئے عوام الناس انہیں پاگل سمجھتے تھے۔ تو خیر، ہم نے پھر کہا۔

"خالہ جان!"

اُدھر سے جواب ملا۔

کچھ کہو گے بھی"۔

ہم نے پوچھا۔

"کیا وقت ہوگا؟"

"خالہ بولیں"۔

"یہی کوئی دس بجے ہونگے!"

ہم نے کہا: "کیا دس ہی؟ ہماری گھڑی میں تو بارہ بجے ہیں"۔

خالہ نے ہنسکر کہا۔

"تمہاری گھڑی جو ہوئی۔ جیسی روح ویسے فرشتے"۔

"خالہ بی! ایک بات کہیں"۔ ہم نے بناوٹ سے کھانستے ہوئے کہا

خالہ بولیں۔

"ہاں ہاں! کہو"۔

ہم نے کہا۔

"کہیں تو سہی لیکن شرم آتی ہے"۔

خالہ بولیں۔

"بڑے پاگل ہو تم۔ مجھ سے شرم کیسی؟"

خالہ نے اب پھر جو ہمیں پاگل ہی کہا تو ہم پھر ذرا مسکرا دئے۔ اور یقین ہونے لگا۔ کہ ہو نہ ہو ہم میں کوئی بات تو ضرور ہے جو خالہ ایسی تجربہ کار ہمیں پاگل کہہ رہی ہیں۔

خیر! ہم نے کہا۔

"تم سے تو شرم نہیں لیکن جو کوئی سن لے تو پھر"۔

"سنے گا کوئی کیسے؟" خالہ بولیں۔ "میرے سوا تو یہاں اور کوئی ہے نہیں ——"

ہم نے جواب دیا۔

"جانے کوئی کواڑ ہی سے لگا ہو"۔

خالہ بولیں۔

"محض بہانے بنا رہے ہو تم"۔

ہم بولے۔

"خالہ بی! تمہارے ہی سر کی قسم بہانہ نہیں کرتے"۔

"تو پھر کہتے کیوں نہیں؟"

ہم پھر ذرا بناوٹ سے کھانسنے لگے پھر کہا۔

"بیاہ کے متعلق......" لیکن اس سے زیادہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اس لئے جلدی سے پوچھا۔

"آج موسم کیسا ہے؟"

خدا کا شکر ہے کہ خالہ نے پہلے الفاظ نہیں سنے۔ بھنا کر بولیں۔

"تو کیا اسی لئے پہر بھر سے بک بک رگا رکھی تھی۔ خیر! موسم کی پوچھتے ہو تو کمرے کا موسم گرم ہے۔ اور باہر شدت کی سردی ہے۔ فضا اداس اداس سی ہے بارش بھی........"

لیکن ہم نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"خالہ بی! اُداسی کیسے نظر آسکتی ہے کبھی ہمیں بھی تو دکھاؤ"۔

خالہ یہ سنکر ہنسیں اور کہنے لگیں۔

"سچ مچ ہی پاگل ہو تم۔ تو ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ بارش بھی ہو رہی ہے۔ سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے ہیں۔ میں نے کمرہ میں آگ جلا رکھی ہے اور کمرے کی کھڑکیاں

کھول رکھی ہیں کہ کمرہ زیادہ گرم نہ ہو جائے۔ کسی کسی وقت کہیں سے پھولوں کی بو باس بھی آجاتی ہے۔ لیکن پھولوں کی مہک کا لطف تو صرف تم جوان لوگ ہی اٹھا سکتے ہو ہم بوڑھوں کو تو اس سے جوانی کے دِن یاد آنے لگتے ہیں۔ اس لئے میں نے تھوڑی سی گندھک بھی جلا رکھی ہے"۔

اتنا کہنے کے بعد خالہ نے پوچھا۔

"سنتے ہو یا سوتے ہو؟"

اور ہم نے کہا۔

"خالہ بی! تم اگر لقمان کی خالہ ہوتیں تو لطف ہی آجاتا"۔

ہمارا اتنا کہنا تھا کہ خالہ نے اٹھکر ہمارے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور ادھر ہمیں اپنی شرمیلی طبیعت پر غصہ آنے لگا۔ کہ ہم خالہ سے شادی کا ذکر کرتے کرتے کیوں رک گئے۔

خیر کچھ دیر تو ہم چپکے پڑے رہے پھر ہولے ہولے کھانسنے لگے آخر یہ حربہ کارگر ہو ہی گیا۔ خالہ نے ادھر سے آواز دی۔

"یہ کھانسی کب سے ہے تمہیں؟"

ہم نے کہا۔

"دم گھٹ رہا ہے ہمارا دھوئیں سے"۔

"دھواں کہاں سے آ گیا؟" خالہ بولیں۔ "تمہارے تو کمرے کا دروازہ بند ہے"۔

"دروازہ بند ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ ہم نے جواب دیا۔ "تمہارے کمرہ کی چمنی سے دھواں نکل کر ہمارے کمرے کی چمنی کے راستے اندر آ رہا ہے"۔

ساتھ ہی ہم نے کہا۔

"خالہ بی! یہ سائنس کا مسئلہ ہے تم نہیں سمجھ سکتیں۔ دھواں اپنا راستہ آپ بنا لیتا ہے"۔

خالہ نے اٹھ کر دروازہ کھولدیا۔ پھر اپنے کام میں لگ گئیں۔ کچھ دیر کے بعد بولیں۔

"کیا کرتے ہو؟"

"لکھ رہا ہوں"۔ ہم نے کہا۔

"بیکار باتیں لکھنے سے کیا حاصل ہے؟" خالہ بولیں۔

"بیکار باتیں کیوں؟" ہم نے کہا۔ "اپنے خیالات قلمبند کر رہا ہوں"۔

"خیالات؟ خالہ نے پوچھا۔ "کیسے خیالات؟"۔

"وہی جن سے انسان کو دنیا میں عزت اور شہرت حاصل ہوتی ہے" ہم نے جواب دیا۔

"کہیں گھاس چرنے تو نہیں گئی عقل تمہاری؟" خالہ نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ "شیخ چلی ہو پورے"۔

"ہم شیخ چلی کیوں ہونے لگے۔ خالہ بی!" ہم نے کہا۔ "تم کیا جانو یہ جتنے بڑے بڑے "خانہ ساز لیڈر" جو تم دیکھتی ہو سب اپنے خیالات کے بل بوتے ہی تو شہرت پاتے ہیں اور دولت کماتے ہیں"۔

"وہ کیسے" خالہ نے پوچھا۔

"بتائے دیتے ہیں" ہم بولے۔ "یہ لوگ تو زمانے کی نبض دیکھتے ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ برپا رکھتے ہیں۔ تاکہ انکی لیڈری کی آگ سرد نہ ہونے پائے۔ کبھی ہندو مسلم اتحاد کا ڈھونگ رچا دینگے۔ کبھی مخلوط انتخاب کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دینگے۔ کہیں اصلاحات کی ڈونڈی پیٹنے لگیں گے۔ کہیں کونسلوں کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کر دینگے اور کہیں کسی نااہل سے سو پچاس لیکر اسے کونسل کی ممبری کے لئے کھڑا کر دینگے۔ کہیں ذاتی مفاد کے لئے قومی مفاد کو بھینٹ چڑھا دینگے۔ تو خیر! روٹی تو کما کھائے۔ کسی طور مچھندر والی بات ہے۔ لیکن دیکھو جو کچھ بھی ہے

محض خیال کی کرامت ہے؟ ہے نا خالہ بی ٹھیک؟

خالہ بولیں۔

"سمجھ گئی۔ گویا تمہیں بھی لیڈر بننے کا خبط سمایا ہے۔ لیکن یہ تو بیکار لوگوں کے کام ہیں"۔

"ارے توبہ کرو خالہ بی"۔ ہم نے جواب دیا۔ "ہم تو کچھ اپنی قوم کی شریف بیبیوں کے متعلق لکھ رہے تھے۔ وہی جو گھر سے تو برقعہ پہنکر نکلتی ہیں لیکن لالہ جی کی دوکان پر پہنچکر برقعہ اٹھا کر یوں بے تکلف بیٹھ جاتی ہیں جیسے خانو جان کے پاس بیٹھی ہیں"۔

"محض بیکار باتیں ہیں"۔ خالہ بولیں۔ "یہ لکھنا وکھنا چھوڑ دو تم"۔

"تو پھر اور کیا کریں؟" ہم نے پوچھا۔ "وقت بھی تو کاٹنا ہوا"۔

"پڑھا کرو"۔ خالہ نے جواب دیا۔

"خالہ بی"! ہم نے ہنسکر کہا۔ "اگر سبھی لوگ پڑھنا ہی شروع کر دیں۔ تو پھر لکھا کون کرے؟ غلط سلط تنقیدیں کون کیا کرے۔ دل آزار مضامین لکھ کر جلے دل کے پھپھولے کون پھوڑا کرے اور پھر پڑھنا تو اپاہجوں اور بیماروں کا کام ہے یا وہ لوگ پڑھا کریں جن کی ابھی شادی نہ ہوئی ہو۔ ٹھیک ہے نا خالہ بی؟"

خالہ نے ہنسکر کہا۔

تمہاری بھی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ بھیّا! کچھ کماؤ گے ہی تو جورو بھی ملیگی"۔

ہم نے ہنسکر جواب دیا۔

"لیکن یہ فکر تو اُسے ہو جس نے بیاہ کرنا ہو۔ آجکل کی لڑکیوں کے ڈھنگ تو تم دیکھتی ہو۔ بس تو یہ ہے جو ہم جورو کا نام بھی لیں"۔

"کیسے ڈھنگ؟" خالہ نے پوچھا۔

"وہی تو ہم لکھ رہے تھے۔" ہم نے کہا۔ "سنو گی خالہ"

"ہاں سُناؤ تو ذرا۔" خالہ بولیں۔

"لو سُنو خالہ بلّی ....." ارے توبہ! کہنا تھا۔ خالہ بی لیکن منہ سے نکل گیا خالہ بلّی" خالہ کے خوف سے گھٹنوں میں سر دے کر ہو بیٹھے۔ لیکن دو ایک منٹ کے بعد ادھر سے آواز آئی۔

"کیا پھر لکھنے لگے؟"

"تو تم نے سنا ہی نہیں"۔

"تم کچھ کہتے تو سنتی بھی"۔

"یہ سنکر ہماری جان میں جان آئی کہ "وے بخیر گذشت" ورنہ ہماری خالہ اور

تارڑ سے رکے تو جناب ہم اطمینان کا سانس لیکر بولے

"سنتی ہو خالہ"۔ ہم نے کہا۔

"ہاں کہو"۔

ہم نے کہا "یہ تو ہم کہہ چکے کہ شادی تو ہم بھی کرینگے نہ تو بہ نہیں کرینگے"۔ ادھر سے خالہ بولی۔

"تمہیں تو شادی کے خواب آ رہے ہیں"۔

"ہرگز نہیں"۔ ہم نے کہا۔ "ہم نے لکھا تو تھا۔ لیکن کاٹنے کا خیال نہ رہا۔ اس لئے پڑھا گیا۔ تو خیر! اب جہاں تک ہندو قوم کا تعلق ہے ممکن ہے کہ ہندوستان کو سوراج مل جائے۔ کیونکہ ہمارے اہل زبان کی باسی کڑھی میں اُبال آنے لگا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ملک میں فرقہ وارانہ فساد کی بجائے محض "زبان کے لئے" گھول" ہونے لگیں۔ کیونکہ زبان کے پہلوان اب پھر خم ٹھونک کر غریب پنجاب والوں کو للکارنے لگے ہیں سنتی ہو خالہ؟"

خالہ بولیں۔

"سن تو رہی ہوں۔ لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"تم سنے تو جاؤ"۔ ہم نے کہا۔ "ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ اس چھیڑ خانی سے

کیا حاصل ہوگا اور لکھنے والوں کا اصل مقصد کیا ہے۔ کیونکہ ہماری نظر سے تو پنجاب والوں کی کوئی ایسی تحریر نہیں گذری جس میں اُردو کے مخلص خادموں نے کبھی زباندانی کی ڈینگ ماری ہو۔ یا کبھی اہل زبان کو کوسا ہو۔ یا میرؔ و مرزاؔ کی زبان پر نکتہ چینی کی ہو بلکہ زبان دانوں کے "دو شہور اکھاڑے"۔ ایک مدت سے اپنی "استادی" تسلیم کروانے کے لئے بالکل بھٹیاروں کی طرح ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے رہتے ہیں اور اس جھائیں جھائیں میں پڑ کر کفن چوروں کی طرح گڑے مُردے اکھیڑنے سے بھی نہیں چوکتے۔"

"ہم تو ایمان کی کہینگے۔ پنجاب والوں نے کبھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا . . . . ."

خالہ بات کاٹ کر بولیں۔

"اے سنو تو!"

"کیا ہے خالہ؟" ہم نے دروازہ کی طرف جھک کر پوچھا۔

"تم تو کچھ عورتوں کے متعلق کہہ رہے تھے یہ کیا لے بیٹھے؟"

"خالہ!" ہم نے کہا۔ "تم ذرا ہمارے خیالات کی بلند پروازی تو دیکھو یہ اپنے بس کی بات نہیں اللہ کی دین ہے۔ تم سنتے جاؤ! ابھی عورتوں کا بھی ذکر آجاتا

ہے۔ تو ہاں ہم کہہ رہے تھے۔ کہ پنجاب والوں نے کبھی اس حقیقت سے آج تک تو انکار نہیں کیا کہ

"دہلی لکھنؤ نے اردو کو علمی زبان بنایا..... اکبر آباد نے اجلا جوڑا پہنایا۔ لکھنؤ نے اسکی آنکھوں میں کاجل لگایا۔ زلفوں میں شانہ کیا۔ ہاتھوں میں مہندی لگائی۔ چبانے کے لئے نفیس گلوریاں دیں کہ ہونٹ لال ہو جائیں"۔

اور اس طرح اسے ایک خوبصورت دلھن بنا دیا۔ سنتی ہو خالہ! لو آگیا نا دلھن کا بھی ذکر لیکن اس دلھن سے وطن میں سلوک کیا ہوا؟ یہی نا کہ غریب گھر سے بے گھر ہو کر پنجاب والوں کے پاس اٹھ آئی۔ اور ان گنواروں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ سینے سے لگا کر رکھا۔ آنکھوں کا سرمہ بنایا اور اسکی عزت و آبرو کے لئے ایک دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر ہو گئے کیوں خالہ! سچ کہا ہے نا ہم نے۔ لو اب آگے سنو تو اس سے کسے انکار ہے کہ اگر عورتوں کی زبان سدھر جائے تو ان کے

"بچے بھی وہی زبان بولنے لگیں۔ جو مصری کی ڈلی سے زیادہ
شیریں ہو اور گلاب کی پتی سے کہیں بڑھ کر سبک و نازک"۔

کیوں نہ ہو "عورتوں کی زبان" جو ٹھہری۔ بھلا مردوں کی زبان میں یہ زنانہ پن کہاں؟ ٹھیک ہے نا خالہ؟ تو بہ تو محض ایک چھچھورا پن ہے۔ کہ ہم اس زمانہ میں جب آزادی کا سوال

ملک کے لئے موت اور حیات کا سوال بن گیا ہے۔ اور حقوق کے لئے مرد تو رہے مرد ہندوستان کی صنف نازک بھی پردے سے نکل کر گریبان چاک کئے اور آستین چڑھائے سو پشت کی حیا اور غیرت کو چھپر پر رکھ کر کسی راہ گم کردہ ......"

خالہ پھر بات کاٹ کر بولیں۔

"محض بیکار باتیں ہیں یہ تو۔"

"ٹھہرو خالہ"۔ ہم نے کہا۔ "پہلے ہمیں یہ تو بتلاؤ کہ اس جگہ کس جانور کا نام لکھیں لیکن خیر چھوڑو تم خود ہی سمجھ جاؤگی۔ تو ہاں ان لفظوں کی بحث میں پڑ کر کسی کی دل آزاری کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ ہم تو یہ آج تک نہیں سمجھ سکے۔ اگر یہ پنجاب اسے "مجھے کی بجائے "میں نے" استعمال کریں تو ہمارے اہل زبان بھائیوں کے پیٹ میں درد کیوں ہونے لگتا ہے اور پسلی کیوں پھڑکنے لگتی ہے۔ اور اس صوبہ وارانہ مرض کے دوران میں یہ لوگ ایسے ایسے مضامین کیوں سپرد قلم کرنے لگتے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے دلوں میں نفرت پیدا ہونے لگے۔ کتنا افسوس ہے کہ کوئی صاحب زباندانوں کے علمبردار بن کر اردو کی مرکزیت اور زباندانی" کا پرچم لہرا لہرا کر ایک دنیا کو للکارنے لگتے ہیں اور کہیں اردو زبان کی "مرکزیت اور ادبی خدمات" کی مشعل لیکر خود "حقائق کی روشنی" میں اپنی کورچشمی کا اعلان کرنے لگتے ہیں۔ اور کہیں" زبانوں کے اختلاف" میں الجھ کر کچھ ایسی چوکڑی بھولتے

ہیں کہ مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے۔ ؎

میراث میں آئی ہے اُنہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اور کہیں "اہلِ زبان کی خصوصیت" پر بحث کرتے ہوئے "پدرم سلطان بود" کے نعرے لگانے شروع کر دیتے ہیں۔ اور کہیں "ذاتی پسندیدگی" کا دوسروں پر الزام تھوپ کو اپنی مدح سرائی کا گراموفون بجانا شروع کر دیتے ہیں ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ آپ تحریر کے بڑے "ماہر" اور زبان پر "قادر" واقع ہوئے ہیں۔ لیکن شاید اکبر مرحوم نے آپ ایسے بزرگوں ہی کی شان میں کہا تھا۔ ؎

عجب مجموعہ ہوں میں سرکشی و خاکساری کا

"تو خیر! ان حضرات کی خدمت میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں۔ کہ ان لن ترانیوں سے کچھ فائدہ نہ ہوگا اور جو لوگ خاموشی کے ساتھ بقدر ہمت و وسعت اردو کی مخلصانہ خدمت کر رہے ہیں۔ ان سے الجھ کر آپ کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور اگر یہ پنجاب والے اپنے صوبہ کے مروج الفاظ جیسے "مجھے" کی بجائے "میں نے" (جس کا آپ کو اکثر رونا رہتا ہے۔) اپنی تحریر یا تقریر میں استعمال کر لیتے ہیں۔ تو اس سے نہ تو

انشاء اللہ دہلی کے پھر ایک بار لٹ جانے کا اندیشہ ہے، نہ لکھنؤ میں کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھوٹ جانے کا خوف۔ یہ محض آپ کا حسن ظن ہی ہے کہ پنجاب والے اگر اپنے یہاں کے مروج الفاظ تحریر و تصنیف میں استعمال کرینگے۔ تو میرؔ۔ غالبؔ۔ دردؔ۔ مومنؔ اور امیرؔ کے دواوین کے پرخچے اڑ جائینگے۔ غالباً کسی نے یہ آپ ہی کے لئے کہا تھا۔ کہ ع "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔

اور "باغ و بہار۔ آب حیات اور شعر العجم کے پھولوں سے جو دہلی اور لکھنؤ والوں کے دماغ معطر ہو رہے ہیں"۔ تو آپ کی دعا کی برکت سے ان پھولوں کی بو باس پنجاب والوں کی آب پاشیوں سے کچھ کم نہ ہو گی۔

حضرت علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

لیکن خوئے دل نوازی تو تب پیدا ہو۔ جو کسی میں امیر کارواں ہونے کی صلاحیت بھی ہو۔

تو اس زمانے میں جب یاران وطن اردو کے خلاف ایک خوفناک پراپگنڈہ

کر رہے ہیں اور پنجاب میں اردو کی بجائے ہندی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ آپ کے قلم کی جولانیاں پنجاب میں اردو کے استحکام کے لئے مفید ثابت نہ ہونگی۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس غریب کو گھر سے بے گھر کر کے آپ اب بھی آرام نہیں لینے دیتے۔ ہوش کیجئے نہ تو یہ پنجاب والوں پر رحم کیجئے اور اپنی چشم التفات کا گوشہ کسی اور طرف پھیریئے۔ وہ بات نہ ہو کہ ؎

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اُسے میں بہت نہ پیار آئے

اور اگر آپ یہ باتیں محض دل لگی کے لئے کرتے ہیں۔ تو حضرت سنئے ایک اہل زبان ہی فرما گئے ہیں ؎

بُری ہے اے داغ راہِ الفت خدا نہ لیجائے ایسے رستے
جو اپنی تم خیر چاہتے ہو تو بھول کر دل لگی نہ کرنا

اور جو یہ بات نہیں اور آپ محض دل جلانے کے لئے ایسے دل آزار مضامین لکھتے ہیں تو یہ بھی آپ کے بس کا روگ نہیں کیونکہ دِل تو وہ جلائے جو بقول غالبؔ

زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

ہو۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ ذرا "گورے گورے" رخ کو زیادہ عریاں کرنے کے لئے برقعہ

تو چھوڑا ابھی نہ تھا۔ اب زلفِ سیاہ بھی کاٹی جا رہی ہے۔ (خدا کرے کہیں ناک نہ کٹ جائے)

"خالہ بی!" ہم نے پھر کہا۔ "لو آگیا نا عورتوں کا ذکر ——— اور چونکہ آج کل ہر چیز کی کساد بازاری ہے۔ اس لئے برقعہ یا چادر کا استعمال ترک کر دینا اور بالوں کو کاٹنا اور بغیر آستین کے نصف سینے کو عریاں کرنے والی کرتی پہننا بھی ایک قسم کی قومی کفایت شعاری ہے"۔

"خالہ بی!" ہم نے پوچھا۔ "ٹھیک کہا ہے نا؟ اب بولو۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

وہ ہنسکر بولیں ——— "محض بیکار باتیں ہیں"۔

چلو چھٹی ہوئی۔

ہمارا نمبر

ہمارا منبر

اگر آپ کسی حکیم سے امراض کے اقسام کے متعلق استفسار کریں تو یہ بزرگ اللہ میاں کا نام لیکر اور نہیں تو ایک سو ایک امراض کے نام تو انگلیوں پر گن دینگے اور پھر ریش پر ہاتھ پھیر پھیر کر یا سر کھجلا کھجلا کر یا عینک کے تال رومال سے صاف کر کے گننے بھی اور گنوا دیں وہ رہی آپ کی قسمت! لیکن تہذیبِ نو جو امراض اپنے ساتھ لائی ہے ان میں سے ایک کا نام بھی یہ بزرگ تو رہے ایک طرف ہندوستانی دوا خانہ کی فہرستِ کلاں میں بھی جو نسخہ ممدر کو سامنے رکھ کر تیار کی جاتی ہے۔ کہیں نظر نہ آئیگا۔ اور جو سچ پوچھئے تو اسی باعث ہندی ہندوستانیوں" کو ویدک اور یونانی ادویات پر سے اعتماد اور اعتبار اٹھا جا رہا ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ دوا کی تاثیر بھی صرف اعتماد پر ہی ہؤا کرتی ہے ہمارے یہاں "بوم بھاشہ" کے رسیا تو اب بھی محض ہندو دھرم کی خاطر ویدک کی طرف ذرا اس طرح جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے "لوبھی" مسلمان کانگرس کی طرف۔ لیکن ہندوستانی یونانی طب سے کچھ اس طرح نفرت کرتے ہیں۔ جیسے گاندھی اردو سے۔ کیونکہ بقول گاندھی اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اور چونکہ قرآن پاکیزگی اور صدق و صفا کی تعلیم

خیر ہم نے کہا۔

"یہی کہ آج آپ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہیں"۔

غازی صاحب ایک شانِ دلربایانہ سے سر ہلا کر بولے۔

"یہ تو بالکل ٹھیک ہے اور اس کا علاج بھی آپ ہی کے پاس ہے۔ کہہ دوں؟"

"جب آپ آئے ہی اسی غرض سے ہیں تو پھر کہنے میں تکلف کیسا؟" ہم نے جواب دیا۔

کہنے لگے

"ہم نے اسکلم نمبر نکالنے کا ارادہ کیا ہے"۔

"شکریہ!" ہم نے کہا "بہت مبارک ارادہ ہے۔ لیکن دو چار سال صبر کیجئے اور اگر ٹھیک میعاد معلوم کرنی ہو تو حضرت عزرائیل علیہ السلام کے دفتر میں درخواست دے کر معلوم کر لیجیے"!

"لیکن ہم تو اعلان بھی کر چکے!" غازی صاحب نے ذرا الفقص امن پیدا کرنے والے انداز سے پوچھا۔

"یہ سب دن بھر دھوپ میں مارے مارے پھرنے کے اثرات ہیں"۔ ہم نے جواب دیا۔

دنیا ہے۔ اسلئے گاندھی اس کا کہاں متحمل ہو سکتا ہے۔ تو خیر! اسے تو سرے رلا ہے سمجھئے۔ بحث تو امراض پہ ہو رہی تھی۔ آپ مان لیں کہ ہم حکیم نہیں۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں حکیم صاحبان سے آئے دن واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ اس لئے ان بزرگوں کے نسخے استعمال کرنے کرنے کچھ حکیمانہ باتیں ہم نے بھی سیکھ لی ہیں۔ اور ہم نبض پر ہاتھ رکھے بغیر صرف تیور دیکھ کر ہی دل کا حال جان جاتے ہیں۔

لیجئے! کل ہی کی بات ہے کہ غازی صاحب شام کے وقت تشریف لے آئے اور آتے ہی فرمانے لگے۔

"آپ میرے اس وقت آنے پر حیران تو ضرور ہوں گے لیکن محض اس لئے آگیا ہوں کہ ع "شام کو گھر بیٹھنا قابل الزام ہے"۔

اور پھر آپ کو ایک تکلیف بھی دینی ہے"۔

"حضرت!" ہم نے کہا۔ "یہ تو آپ کی شکل و صورت سے ہی ظاہر ہو رہا ہے"

"کیا؟" غازی صاحب نے بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے پوچھا۔

آپ جانیئے! غازی صاحب کو بوٹ کے تسمے کھولتے دیکھ کر تو جی ہی بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہ تو دیر تک بیٹھے رہنے کی علامت ہوتی ہے۔

"دماغی فساد کا نتیجہ کہہ دیجیئے نا!" غازی صاحب نے پھر اس انداز سے کہا۔

"آپ جو فرما رہے ہیں!" ہم نے کہا۔

"تو پھر اس کا علاج!" انہوں نے پوچھا۔

"علاج ہم بتلاتے ہیں!" ہم نے جواب دیا۔ "آپ جناب قبلہ حکیم سید تبرّ واسطی صاحب کے پاس تشریف لے جائیے۔ ان کے یہاں پرانی شراب نئے شیشوں میں بھری رہتی ہے اور یارانِ طریقت کے جھمگٹے بھی خوب رہتے ہیں۔ لیکن۔ ع
قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا!" کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ آپ بھی قسمت آزما دیکھیئے۔ شاید ....."

"شاید کیا؟" غازی صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔ "بہت پی چکے۔ پرانی ہو یا نئی ہم پر تو اثر ہونے سے رہا۔ ہاں! "خانہ ساز" کی بات اور ہے۔ آپ ہماری جدت کی داد دیں۔ اور ایک پروگرام تیار کر دیں"۔

"جدت کی بھی ایک ہی کہی آپ نے!" ہم نے کہا۔ "حضرت! آجکل ننانویں فیصدی نوجوان اسی جدت طرازی کے مرض میں گرفتار ہیں جسے حکماء اور اطبا کی اصطلاح میں "فساد بالدماغ" کہا جاتا ہے۔ جناب شفاء الملک قبلہ مرحوم و مغفور ایسے مریضوں کا علاج حکیمانہ پھبتیوں سے کیا کرتے تھے۔ اور قسم لے لیجیئے!

ایک دو گھنٹوں میں ہی دماغ ایسا صاف ہو جاتا ہے کہ پھر اس قسم کا دورہ پڑنے کا امکان تک نہ رہتا۔ اب آپ ہندوستانی دواخانہ سے "معجونِ فلاح دماغ" منگوا کر استعمال کیجئے ورنہ تبدیل آب و ہوا کے لئے پاگل خانہ تو موجود ہی ہے"۔

یہ سنکر غازی صاحب نام اللہ تھوڑا سا ہنس کر بولے۔

"تو گویا کسی کے نام پر رسالہ کا نمبر نکالنا حماقت ٹھہری"۔

"کم از کم ہمارے نام کا نمبر نکالنا تو حماقت کی کھلی دلیل اور عقل سلیم کی توہین ہے" ہم نے کہا "اگر یہ 'نمبر بازی' کا سودا سر میں سمایا ہے تو پھر ایسے بزرگوں کے نام پر نکالیئے۔ جو نام و نمود کی خاطر بڑے شوق سے جیل گیا شاید جہنم میں جانے سے بھی گریز نہ کریں اور اگر ان لوگوں سے آپکو سیاسی اختلاف ہو تو پھر "شہیدِ گنج نمبر" نکالیئے۔ اور نہیں تو ذرا اللہ اکبر کے فلک بوس نعرے تو سن لیا کرینگے! اور جو یہ بھی پسند نہ ہو تو "اتحاد ملت" نمبر شائع کیجئے۔ کیونکہ اس سے قوم میں نفاق کی جڑ زیادہ مضبوطی سے قائم ہوتی ہے اور بھوکوں کا پیٹ بھی بھر جاتا ہے اور جو یہ بھی پسند نہ ہو تو یوم بھا شا عرف ہندی ہندوستانی نمبر نکالیئے جس میں گاندھی جیؒ کام کرتے ہیں اور یہ نہیں تو پھر "انجمن اُردو پنجاب" نمبر نکالیئے۔ کیونکہ ایک تو یہ ثواب کا کام ہے دوسرے ممکن ہے کہ انجمن کی معرفت دس پانچ پرچے فروخت بھی ہو جائیں اور خریداران کے نام

تو براڈ کاسٹ ہوں ہی گے اس لئے آپ کا پروپگنیڈا امفت میں ہوجائیگا۔ حضرت!
آپ کس خیال میں بیٹھے ہیں بہار دانش میں بو علی سینا نے اسی کا نام دو کاج ایک پنتھ
لکھا ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ کوئی بڑے نام کا بت تراشئے۔ ہمارے نام کا نمبر نکالنا ایسا
ہی ہے جیسے کوئی استروں کی مالا گلے میں ڈال لے۔ ہم نہ تو کوئی ادیب ہیں کہ ہمارے
"علم کدہ" پر بڑے بڑے المتخلص لوگوں کے جھمگٹے رہتے ہوں۔ نہ کسی اخبار کے ایڈیٹر
کہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے اپنی ہی قوم کو کوسا کریں۔ نہ شاعر کہ محض
ایک پیالی چائے اور چند ٹکڑے پیٹری کے عوض دوسروں کے لئے اشعار کہیں۔
نہ ہم حکیم کہ نبض پر ہاتھ رکھ کر سات پشتوں کے عوارض گنوا دیں نہ شیرازہ کے ایڈیٹر
کہ مستقل خریداروں کے نام پرچہ بھیجنا خلاف تہذیب سمجھیں تو جناب! آپ نے اگر واقعی کوئی
خاص نمبر نکالنا ہے۔ تو اسکے لئے ایسی فضا تلاش کیجئے کہ جہاں ؎

"سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!"

کے لئے ایک لق و دق میدان ہو۔ اور ایسی ڈگر اختیار کیجئے کہ سانپ مرے بانہ مرے
لیکن لاٹھی ضرورت سلامت رہے۔ کیونکہ آجکل ہندو مسلم اتحاد کی فضا ذرا گرم ہو رہی

ہے اور جو ہاتھ میں لاٹھی نہ ہوئی تو پھر وہی حالت ہوگی کہ "چچا سر!"

توحضرت! نزلہ برعضوِ ضعیف کا مصداق بننے کے لئے کیا ہم ہی رہ گئے ہیں۔ اور اگر بالفرض محال آپ کے فاسد ارادے قابل مبارک تسلیم ہو بھی گئے۔ تو ہمارے قدر دان تو سر دھن دھن کر یہی کہینگے کہ دیکھ لیجئے! اسے کہتے ہیں ملوائی کی دوکان پر نانی جی کا فاتحہ"۔

غازی صاحب سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہماری باتوں کا اثر ہو رہا ہے۔ اچانک خیال آیا کہ جو کام زندگی میں ہو جائے وہی اچھا ہے۔ جانے پھر کسی کو خیال آئے یا نہ آئے۔ مہربانوں کے سینے پر مونگ دلنے کا اس سے بہتر اور کونسا موقع ہوگا۔ اس لئے ہم نے ہنس کر کہا۔

"معاف کیجئے! ہم نے ابھی ابھی جو کچھ عرض کیا ہے۔ اسے حرف بہ حرف واپس لیتے ہیں۔ آپ ہی کی رائے ٹھیک ہے۔ نمبر ضرور نکالئے۔ کہئے! مضمون کس کس سے لکھوایئے گا۔

یہ سنکر غازی صاحب کچھ اس طرح دیکھنے لگے گویا انہیں ہماری ہستاد بود میں بھی کچھ شک ہو رہا ہے اور یہ معلوم کرنیکی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ

ہم ہی کہہ رہے ہیں یا کوئی اور صاحب بک بک کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کے رفع تعجب کے لئے کہا۔

"حضرت! گھبرائیے نہیں! لیجئے ہم پروگرام بھی تیار کئے دیتے ہیں۔ سنئے!

ہماری "مزاحی" پر تو جناب حافظ عالمگیر صاحب سے کچھ لکھوا لیجئے۔ آپ "شذرات عالمگیری" کی سند سے یہ ثابت کر دینگے کہ چودھویں صدی کے "مستند" فاضل مزاحیات" صرف ہم ہی ہیں۔

افسانہ نگاری کے متعلق جناب حکیم نیرنگ خیال سے ایک ڈرامہ لکھوا لیجئے۔ اور جو انہوں نے "رنگ میں آ کر کچھ لکھ دیا تو پڑھنے والوں کا اگر رنگ نہ اڑ جائے۔ تو ہم جھوٹے۔

ادب لطیف پر جناب مرزا ادیب صاحب سے ایک افسانہ لکھوا لیجئے۔

"معرب اور مفرس" اردو لکھنے کی شاید کسی اور کو کم ہی مہارت ہو گی اور شاعری پر جناب شوق امرتسری صاحب سے "جو دربار صاحب" کی برکت سے کوئی پونے اڑھائی سو کتب کے مؤلف مؤرخ اور مصنف کہلاتے ہیں ایک جواب مضمون لکھوا لیجئے۔ خدا کی قسم! تاریخ اور فقہ کی سند سے آپ کیا اگر ابوجہل بھی ہو تو ہمارا

لہ۔ اس قسم کی ترکیبیں جناب لحمد صاحب کے یہاں جائز ہیں۔ سند سمجھئے!

دو ہا منوا دیں۔ اب رہی ہماری عادات و خصلیات نہ تو بہ خصائل تو اس کے متعلق ہمارے روٹھے ہوئے دوست جناب مولانا عشرت رحمانی سے خط و کتابت کیجئے۔ شاید وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں اب رہی ہماری زبان تو اسکے لئے کوئی ایسا بزرگ تلاش کیجئے جو زبان کا "ماہر" بھی ہو اور اس "پر" قادر بھی ہو۔

ہاں! اگر کوئی تصویر بھی شائع کرنے کا ارادہ ہو تو پھر تصویر کے نیچے یہ نوٹ ضرور دیجئے۔ کہ یہ تصویر حین حیات میں لی گئی تھی۔ افسوس! اسکے بعد تصویر لینے کا موقع نہیں ملا۔ اور جب رسالہ شائع ہو جائے تو پھر ایک کام آپ کو بھی کرنا ہو گا۔"

"کیا؟" غازی صاحب نے معصومانہ انداز سے پوچھا۔

ہم نے کہا۔

"جب رسالہ یا نمبر نکل جائے یا نکل آئے تو وینا رسٹورانٹ میں شام کے وقت جا بیٹھئے۔ اور ایک ہاتھ میں گلابی لسی کا گلاس اور دوسرے میں یہ رسالہ پکڑ کر ذرا رندوں کے انداز سے جھوم جھوم کر کہئے کہ ؎

نازک خیالیاں میری توڑیں عدو کا سر
میں وہ بلا ہوں شیشوں کو مردوں سے ڈوں ملا

اب رہی "پبلک قدردانی" تو آپ دیکھیں گے کہ ادھر یہ پرچہ اوٹ اوا کی آؤٹ)

ہو گا اور ہر ایک دنیا تعزیت کے لئے ٹوٹ پڑے گی۔ لیجئے ہو گئی تا تسلی آپ کی ؟"

اس طویل بک بک کے جواب میں غازی صاحب نے ذرا مسکرا کر صرف اتنا کہا۔

"بس سمجھ گیا !"

"کیا سمجھے آپ ؟" ہم نے پوچھا۔

"گویا کسی رسالے یا اخبار کا نمبر صرف اس شخص کے نام پر نکالا جاتا ہے جو دنیا سے چل بسا ہو۔ ٹھیک ہے نا ؟"

غازی صاحب نے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا "یہی مطلب ہے نا آپ کا ؟"

"یہی !" ہم نے کہا " بندہ پرور ! ہم تو خدا کے لطف و کرم سے یار لوگوں کی نوازشات کا سینما دیکھنے کے لئے ابھی زندہ ہیں۔ لیکن جانے آپ ہمیں ابھی سے کیوں عدم آباد بھیجنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ آج ہمارے نام پر ایک نمبر نکالئے۔ تو کل ہمارا عرس شریف بھی کر دیجئے۔ لیکن قوالی کی جگہ محفل میں "گناہ کی راتیں" پڑھی جائیں ہمارے مہربانوں میں سے آپ تیسرے ہیں جنہیں جیتے جی ہمیں انا للہ و انا علیہ راجعون بنانے کا شوق چرایا ہے خدا سلامت رکھے۔ ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے !

اتنے میں بجلی کی روشنی کچھ مدھم پڑنے لگی۔غازی صاحب گھڑی دیکھ کر بولے

"اوہو! نو بج گئے۔اب اجازت دیجئے"

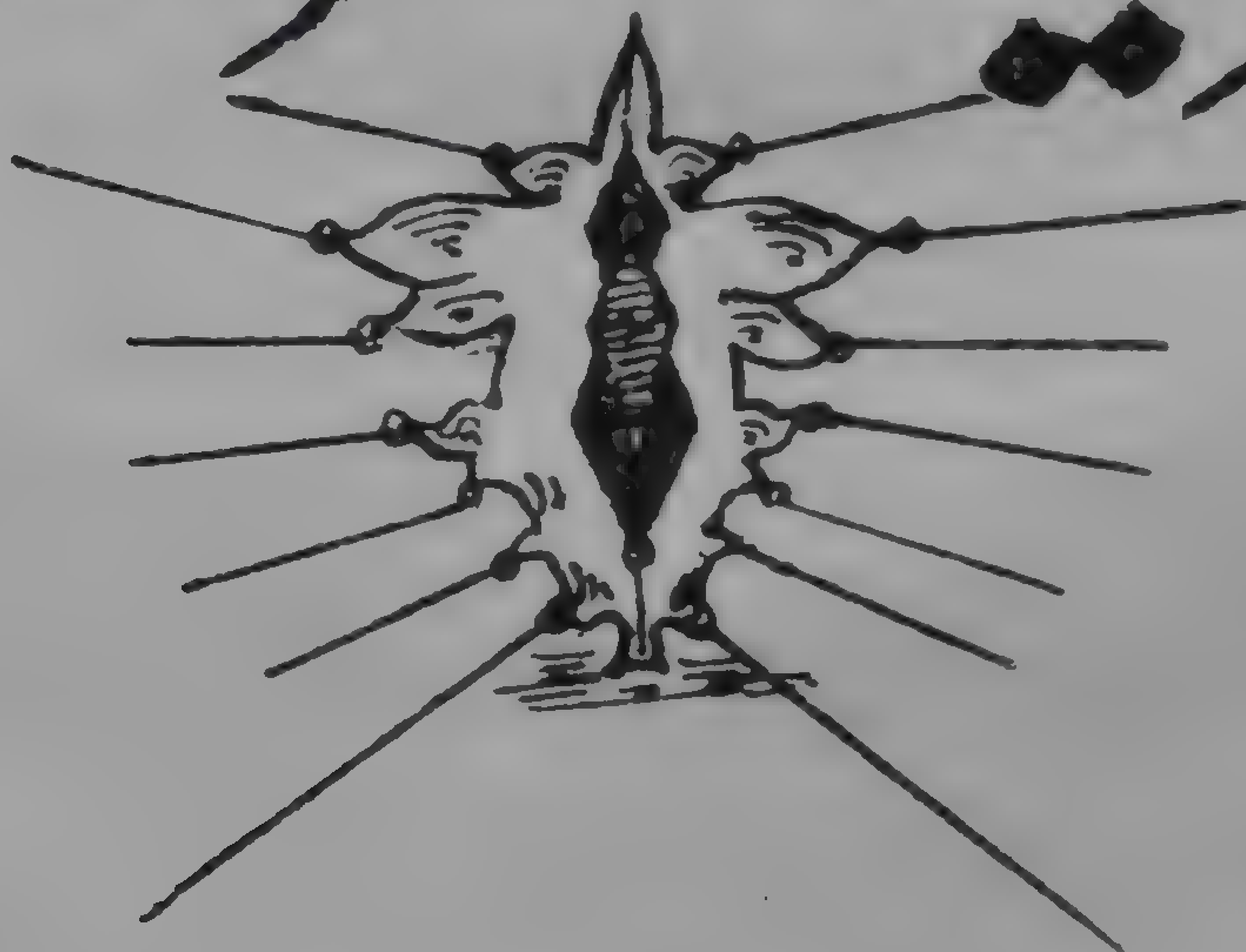
یہ کہکر ٹوپی اٹھا کر چلدیئے۔اور ہم

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت !

انگلیوں پر پڑھتے ہوئے ذرا دراز ہو گئے۔



ظریف اور ظرافت



ظریف اور ظرافت

اس پر ہمارے خیالات

ظریف جسے ادبی دنیا میں مزاحیہ نگار بولا جاتا ہے، بننے یا کہلانے کا تو ہر اس شخص کے دل میں ضرور شوق پیدا ہوتا ہے۔ جس نے اصل خیر سے مڈل تک تعلیم پائی ہو اور خدا کو حاضر اور ناظر جان کر افسانہ نویسی شروع کر دی ہو۔ اور افسانے بھی وہ افسانے کہ ارے معاذ اللہ! نہ توبہ! ماشاءاللہ! ایسے گرم گرم۔ اتنے مزیدار اور اس قدر چٹ پٹے کہ ایک بار پڑھ کر مرتے دم تک کبھی افسانہ پڑھنے کو دل نہ چاہے۔ ایسے ایسے اہل قلم جب افسانہ نویسی کے میدان میں اترتے ہیں تو اپنی گوناگوں خصوصیات سے فسانۂ آزاد کے ایک بار تو "خوجی" ضرور بن جاتے ہیں۔ اور خدا سلامت رکھے ان اخبار اور رسائل والوں کو جو ایسے باکمالوں سے اکثر "بالسٹ ٹرین" کا کام لیتے رہتے ہیں۔

لقمان حکیم نے بوستاں میں ایک مزاح نگار کی جو تعریف لکھی ہے پہلے وہ سن لیجئے پھر کچھ اور عرض کرینگے۔

ظریف یا مزاحہ نگار حقیقت میں صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے دیکھتے ہی ایک چنگے بھلے آدمی کو ہنسی آجائے (اگر کوئی رو بھی دے تو کچھ مضائقہ نہیں) بانس برابر قد ہو "کلّے" طوطا پری آم کی یاد تازہ کرتے ہوں۔ چہرے پر ہوائیاں (آتشبازی کی ہوائیاں نہیں) اُڑ رہی ہوں۔ لباس صرف

صورت بیں حالت مپرس!

کی داستان کہہ رہا ہو اور چال کا بے ڈھنگا پن دیکھ کر راہ چلتے بھی ذرا پلٹ کر دیکھ لیں۔ اگر چندیا بنجر واقع ہوئی ہے تو صحافتی منڈی میں مانگ بھی زیادہ ہو گی۔ اور جو ابلے ہوئے انڈے کی طرح جس پر سے چھلکا اتار لیا گیا ہو صاف اور ملائم ہو تو وہ قطعی مزاح نگار ہے اور اسکی شہرت کا چاند اس طرح چمکے گا۔ جیسے دہلی میں چاندنی چوک یا آسمان ادب پر اس طرح درخشاں نظر آئیگا جس طرح کسی مشکیں نسب معشوق کے کان میں بنارس کے بنے ہوئے پونے تین آنے والے بادلے کے آویزے!

تو جناب! یہ واقع ہے کہ ابتدائے آفرینش میں لوگوں پر ہنسی کا دورہ صرف اس وقت پڑا کرتا تھا جب وہ اپنے کسی ہم جنس میں کوئی ایسی چیز دیکھ پاتے جو

بادی النظر میں انوکھی نظر آتی یعنی جوان کی آنکھوں کو غیر مانوس سی معلوم ہوتی۔

تو ظاہر ہے کہ ہو نہ ہو اس وقت جناب ابن آدم شکل وصورت میں یا "ستر پوشی" کے معاملہ میں کوئی ایسی اختراع یا ایجاد فرما لیتے ہونگے۔ جو ہنسی کی محرک ہوتی ہوگی۔

جس طرح آجکل ایک "راس مرد" مونچھیں منڈواکر فارغ البال بن جاتا ہے اور اکثر کوتاہ نظر اسکی "مستورانہ" شکل دیکھ کر صرف معذرت کے طور پر مسکرا دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان وقتوں میں بھی کوئی ایسی ہی ناشدنی حرکات کا مرتکب ہوتا ہوگا۔ جو دیکھنے والوں کے لیئے ہنسی کا باعث بن جاتی ہونگی۔

اور یہ تو ایک مشہور تواریخی واقعہ ہے۔ کہ ہنسنا مدت تک محض ایک مرض ہی متصور ہوتا رہا۔ اور جو یقین نہ ہو تو ہندوستان کی کوئی جدید تواریخ اٹھا کر دیکھ لیجیئے جس میں "قطب صاحب کی لاٹ" کے متعلق سب سے زیادہ پتے کی بات یہ لکھی ہے۔ کہ آٹھ سو سال تک مسلمانوں نے غیر مسلموں پر جو مظالم روا رکھے ان مظلوموں کی فریاد "برہما" تک پہنچانے کے لیئے ڈاکٹر مونجے اور بنارسی پنڈت جی مہاراج کی کوشش سے یہ لاٹ تعمیر کی گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ قادیاں والے مرزا جی کے وصال کی خوشی میں پہلے آسمان پر

بڑے بڑے مہاپرشوں۔ علاموں اور ودّیا رتھیوں کی مجلس مرزاجی کو "برین عقل و دانش" پر داد دینے کے لئے منعقد ہوئی۔ نو دیوں کو خاکیوں کی اس جسارت پر حیرت سی ہو رہی تھی۔ اور چپکے چپکے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اچانک جناب عزرائیل نے ہنسکر کہا کہ دیکھاے

غافل آداب سے سکانِ زمین کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

یہ سنتے ہی ایک طرف سے "الحق" کا نعرہ بلند ہوا اور!

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں

یہ سنکر پاس سے ہی

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

شاید چچا سعدی تھے۔

توجناب جس طرح مہاشے ڈارون جی مہاراج کے نقطۂ نظر سے بندر شکل

بدلتے بدلتے ارتقائی قلابازی سے انسان بن گیا۔ اسی طرح لقمان حکیم کے نظریہ کے مطابق ہنسی جو محض ایک قسم کی بیماری تھی ہوتے ہوتے عادت بن گئی اور ایجاد کا مادہ چونکہ انسان کی فطرت میں ہے اس لئے اس نے خلیفہ اللہ ہونے کی حیثیت سے ہنسنے ہنسانے کے لئے موقع اور محل بھی پیدا کر لیا۔

رہا ڈارون کا نظریہ تو ممکن ہے کہ مہاشہ جی کی قوم کے لوگ پہلے بندر ہی ہوں۔ لیکن بندر "ضاحک" نہیں ہوتا اور ابن آدم ضاحک ہے اور وہ بھی پیدائشی ہاں ممکن ہے کہ عادات کے لحاظ سے دونوں آوائل میں ایک ایسے حیوان ہی ہوں۔ لیکن یہ کیا کہ ایک تو قیامت تک حیوان ہی رہے اور دوسرا حیوان ناطق بن جائے یہ "نکتہ ناطقی" ہماری عقل سے بالا ہے۔ اس لئے اگر کوئی سیلانی طبیعت کے بزرگ سیر کرتے کراتے کہیں عدم میں جا نکلیں تو ڈارون سے مل کر ہمارا اعتراض ضرور عرض کر دیں۔ ہم رمضان شریف میں استیصال ثواب کے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک آبخورہ کسی "بے روز" کو پلا دینگے۔

پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ بعض لوگوں نے ہنسانا اپنا پیشہ بنا لیا۔ ابتداً ایسے لوگوں کو ہندوستان میں بھانڈ اور یورپ کے درباروں میں "فول" یا "جسٹر" کو خطاب

ملا۔ یورپ میں اس پیشہ کے جو پڑھے لکھے آدمی تھے۔ وہ اپنی سوانح حیات جسے فیشن پرست ڈائری کہتے ہیں روز کے روز قلمبند کئے جاتے۔ یورپ میں کچھ مدت بعد یہی خرافات یا ملفوظات مزاحیہ شاہکار قرار پائے۔ اور جب تہذیب اور تعلیم کا دور دورہ ہوا تو ڈاروِن کے نظریہ کے مطابق بھی "فول اور جسٹر" ترقی کرتے کرتے "ہیومرسٹ" بن گیا اور اس نے لاکھوں کمائے۔ اور جن باکمالوں نے اسے ادبی رنگ دیا انہوں نے محض اشہب قلم کے زور سے وہ نام پایا کہ قدردان ان کے مضامین سونے میں تول تول لینے لگے۔

اب رہا ہندوستان۔ تو جناب! اوّل تو کسی نے اس فن کی طرف توجہ ہی نہیں فرمائی

لیکن جب اوروں کی دیکھا دیکھی کچھ شوق چرایا بھی تو وقت گذر چکا تھا ؎

جب باہم پیار کے جلسے تھے دستورِ محبت قائم تھا!

اور اسکی بجائے:۔

اب بحث میں اُردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

غور کا مقام ہے کہ جب صورتِ حال اس قدر خوشگوار واقع ہوئی ہو اور ملک کا ملک اوروں کے لئے مکمل "مذاق" اور سامانِ ظرافت بن چکا ہو۔ تو مزاح نگاری کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے۔ یورپ والوں کے یہاں تو محض لفظی ظرافت یا مذاق

ہے اور ہم ہندوستان والے تو اپنے یہاں کی ظرافت کی عملی داد دیتے ہیں۔ آپ پیپل پر کلہاڑا چلایئے تو دوسرا آپ کی گردن پر کلہاڑا چلائے گا۔ آپ گائے ذبح کیجئے تو کوئی آپ کو ذبح کرنے اٹھ دوڑیگا۔

ظرافت کا لطف تو صرف ہم ہندوستان والے ہی کچھ اُٹھاتے ہیں یورپ والونکی تو یہ بات ہے کہ:۔ چہ داند جان بُل لذات ادرک!

تو جناب! یہ تو رہی عملی ظرافت اب لفظی ظرافت کو لیجئے۔ ہمارے مزاح نگاروں کی قدردانی کا اندازہ اسی سے فرمالیجئے کہ ان کے شاہکار کوئی بدمذاق چار آنے میں بھی خریدنا ناپسند نہیں کرتا۔ ہاں! خدا خوش رکھے ہمارے اڈیٹروں کو جو حاتم کی قبر پر لات مار ایک مضمون کی قیمت ساڑھے تین آنے سے کم آپ کی خدمت میں کبھی پیش نہ کرینگے اور وہ بھی نقد نہیں بلکہ اپنے مقبول عام و خاص رسالہ کی صورت میں۔

خدا سلامت رکھے ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

ہاں خوب یاد آیا۔ ہم کچھ مزاح نگاری کے متعلق عرض کر رہے تھے۔ آپ جانئے! جس شخص کی طبیعت حساس واقع ہوئی ہو۔ اس میں سولہ آنہ میں چودہ آنہ ظرافت

کا لطیف مادہ ضرور ہوگا۔ اسی طرح جس بندۂ خدا کی طبیعت میں لالچ ہو حرص ہو۔ اور عشق دعاشقی کے سوا کیسی کام میں ناکام نہ رہا ہو کبھی ظریف نہیں ہو سکتا۔ اور لیجئے! جس بھلے مانس کی تصویر کسی اخبار کے سرورق پر اس طرح نمایاں ہو جس طرح کسی گندم نما جُو فروش غازی کے ماتھے پر گھٹا۔ اسے بھی ظریف مان لیجئے۔ مذہبی پہلو سے دھوکا یا فریب گناہ ہو تو ہو لیکن دنیوی نقطۂ نظر سے جو شخص آپ سے فریب کرے اس میں بھی ظرافت کے کم و بیش جراثیم ضرور ہونگے۔

اگر آپ کا کوئی دوست سرکار سے خطاب پا کر آپ سے گریز کرے تو اسے بھی ظریف ہی جانیئے۔

یا دش بخیر! اگر کسی پبلشر کی دعا "برکت" سے آپ کو کچھ مالی نقصان پہنچ گیا ہو۔ تو اس ذات شریف کو بھی ظریف ہی متصور فرمائیے۔

اسی طرح اگر کوئی دوست بلا وجہ آپ سے ملنا جلنا چھوڑ دے اور اتفاق سے کہیں راستہ میں آپ سے مٹھ بھیڑ ہو جائے اور جھٹ کہدے کہ لو میں تو آپ ہی کی طرف جا رہا تھا تو سمجھ لیجئے کہ وہ بھی ظرافت سے محروم نہیں۔

اسے بھی ظریف ہی جانئے۔ جو کسی الیکشن کے زمانے میں روپے تولے آپ سے اور ووٹ دے آپ کے مخالف کو۔

اب رہی حکمت۔ تو اصل خیر سے وہ حکیم حکیم ہی نہیں جس میں ظرافت نہ ہو۔ اور ادویات کے ساتھ ساتھ اسکے استعمال کا موقع اور محل نہ جانتا ہو۔ اور جس مسیحا کو مبداء فیاض سے حکمت کے ساتھ ظرافت بھی عطا ہوئی ہو تو دنیا اُسے حکیم ہی نہیں بلکہ "قبلہ شفاء الملک"[۵] کہے گی۔

اور جو ہم سے پوچھئے تو اصل ظرافت یہ ہے کہ ؎

صاف آنکھیں پھیر لے مطلب نکل جانے کے بعد

۵۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں!

جسکی لاٹھی اُس کی بھینس

جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس

ذرا آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے میں نے برآمدے میں پام کے دس بیس گملے رکھ چھوڑے ہیں۔ گھر میں ملازم بھی موجود ہیں۔ لیکن خدا کے لُطفِ مدام سے وہ سب ذرا "لطیف المزاج" واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے اکثر پچھلے پہر مجھے خود ہی ان میں پانی دینا پڑتا ہے لیکن مجھے اس کا گلہ نہیں۔ کیونکہ اس سے کچھ ورزش بھی ہو جاتی ہے، دوسرے اسی شغل میں کبھی کوئی مضمون بھی سوجھ جاتا ہے۔ اس مضمون کی شانِ نزول بھی ایک اسی قسم کا واقعہ ہے۔

میں ایک روز پچھلے پہر گملوں میں پانی دے رہا تھا۔ کہ ایک صاحب جو قطع وضع سے خاصے بھلے مانس معلوم ہوتے تھے۔ تشریف لے آئے۔ میں نے ذرا تعجب سے انکی طرف دیکھا۔ برآمدے میں دو ایک کرسیاں رکھی تھیں۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھئے"۔

"شکریہ!" کہکر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور مسکرا کر کہنے لگے۔

"میں مخل تو نہیں ہوا؟"

"ہرگز نہیں"۔

"آپ پانی خود دے رہے ہیں؟"

"جانے یہ نوکر شیطان کہاں چلا گیا ہے"۔ میں نے کہا۔

"میرا نام بھی تو شیطان ہی ہے" یہ اُس نے ہنسکر کہا۔

"شیطان؟"

"جی ہاں!" وہ مسکرا کر بولا "غالباً اِس نام سے تو آپ نا آشنا نہ ہونگے؟"

"نام تو کچھ اتنا غیر معروف نہیں"۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ پانی دے چکے"۔

"جی ہاں!" "دے ہی چکا ہوں"۔

"آپ کچھ حیران سے نظر آرہے ہیں؟"

"نہیں تو!"

"اجی حضرت!" شیطان نے ہنسکر کہا۔ "نہیں تو کیا! یہ تو آپ کی شکل ہی کہے دیتی ہے" "کیا!"

"وہی جو آپ کے دل میں ہے" شیطان بولا "معاف فرمائیے! میں ذرا بے تکلف سا واقع ہوا ہوں"۔

"یہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں" میں نے ہنسکر کہا۔

"خیر!" شیطان بولا "اتنا ہی غنیمت ہے آپ ذرا ہنس تو لیے"۔

"کچھ پئیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"شکریہ!" اس نے مسکرا کہا "یہاں تو بن پیئے ہی مدہوش رہتے ہیں۔" پھر ایک قہقہہ لگاکر "میری اس بے تکلفی کو آپ غالباً بیہودگی تصور فرماتے ہوں گے۔ لیکن میرے مذہب میں اسی کا نام زندہ دلی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"مذہب؟" میں نے ذرا تعجب سے کہا۔

"ہاں مذہب!" اس نے اپنی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر جما کر کہا "آپ میرے مذہب کی پوچھتے ہیں۔ میرا مذہب یہ ہے۔ کہ جس طرح بھی بن آئے۔ دل خوش رکھو!"

میں نے ہنسکر کہا "آپ کے نام کی مناسبت سے تو یہ مذہب خوب ہے"۔

"جی ہاں!" شیطان نے ہنسکر کہا "لیکن اتنا تو آپ بھی مانیں گے۔ کہ میرے نام کی مناسبت سے اکثر شریف لوگوں کے کردار کو میرے مذہب سے بھی زیادہ مناسبت ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"ایک بات کہوں"۔ شیطان نے کہا۔

"ارشاد!"

"آپ کو میرا یوں چلے آنا ناگوار تو نہیں ہوا؟"

"ہرگز نہیں"۔ میں نے میز پر سے ایک کتاب اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے نام سے تو آپ کو ضرور نفرت ہوگی"۔ شیطان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا

"دیکھئے سچ کہئے گا"۔

"نام سے کیا ہوتا ہے"۔

"خیر!" شیطان بولا۔ "اتنا تو معلوم ہوگیا کہ آپ تنگ خیال نہیں"۔

"شکریہ!"

"یہ کونسی کتاب ہے؟" شیطان نے پوچھا۔

"مدر انڈیا!"

"کیا رائے قائم کی آپ نے؟"

"واہیات ہی ہیں"۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔

"مصنف کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟" شیطان نے پوچھا۔

"خوب بکھتی ہے"

"غالباً آپ اُسے متعصب تو نہ سمجھتے ہونگے۔"

"میں کیوں متعصب سمجھنے لگا" میں نے جواب دیا۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آتا ہے وہی!

جہاں نہ کسی کو مذہب کا پاس ہو نہ اخلاق کی طرف توجہ ہو ان لوگوں کو کوئی جتنا بھی ذلیل کرے بجا ہے"۔

"مذہب تو ہے ہی ایک بیکار چیز" شیطان بولا "سو اُسے تو رکھیے چھپر پر"۔

"مذہب بیکار!" میں نے شیطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن یہ سب آپ کی ہی تو کرامت ہے"۔

"میری کرامت کیسے؟" شیطان بولا "میں نے کوئی نیا مذہب تو کسی کے سامنے پیش کیا نہیں مجھے تو جب کبھی کچھ عرض کرنیکا موقع ملتا ہے۔ عین فطرت کے مطابق صلاح دیتا ہوں۔ لیکن میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ خوشی کا سودا ہے کوئی مانے یا نہ مانے"۔

لیکن یہ گل تو آپ کے ہی کھلائے ہوئے ہیں" میں نے کہا۔

"تو گویا مدر انڈیا' میری تحریک سے ہی لکھی گئی!" شیطان نے ہنسکر کہا "یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

"میں تو عرض کر چکا" میں نے کہا "کہ یہ سب گُل آپ کے ہی کھلائے ہوئے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" شیطان نے پوچھا۔

"آپ کے ہی مشوروں کا ظہور ہے" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں! یہ تو فرمائیے کہ مذہب فطرت کے مطابق ہے یا آپ کے ارشاوات یا مشورے؟"

"آپ کا مذہب سے کیا مطلب ہے؟" شیطان نے پوچھا

"یہی!" میں نے جواب دیا۔ "کہ ایک خدا کی پرستش کرو۔ نیک بنو فسق و فجور سے اجتناب کرو۔"

"بجا ارشاد ہوا۔" شیطان بولا "لیکن میں نے بھی تو یہ کبھی نہیں کہا۔ کہ ایک خدا کی بجائے دو خدا مانو۔ پکے شہدے بنو۔ بس میتو نے جو کچھ لکھا ہے آپ مجھے اسکا ذمہ وار گردانتے ہیں۔ تو کیا میں نے ان لوگوں سے کہا تھا۔ کہ تم یوں تہذیب کے پیچھے ڈنڈا لئے پھرو۔ نہیں! بات حقیقت میں یہ ہے کہ مجھے دوسروں سے کچھ زیادہ انسان کی فطرت کے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں صرف فضا یا ماحول کچھ ایسا پیدا کر دیتا ہوں۔ جو عین فطرت کے مطابق ہوتا ہے اسکے بعد آپ جو کچھ کریں اسکے ذمہ وار آپ ہیں یہ نیاز مند ہرگز نہیں۔"

"ہاں!" میں نے کہا۔ "آپ جو فضا پیدا کرتے ہیں۔ وہ کچھ ایسی خطرناک ہوتی ہے کہ انسان کچھ عرصہ کے لئے انسان نہیں رہتا۔"

"یہ کہئے نا!" شیطان نے ہنسکر کہا۔ "کہ میں بھنگ گھوٹ کر فضا میں ملا دیتا ہوں۔"

"کچھ بھی سہی!" میں نے کہا۔ "آپ محرّک ضرور ہوتے ہیں ——!"

"اجی حضرت!" شیطان نے ہنسکر کہا۔ "زندگی نام بھی تو حرکت کا ہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن آپ انسان سے جو حرکتیں کرواتے ہیں۔ خدا ہی بچائے۔"

"اجی جناب!" شیطان ہنسکر بولا۔ "آپ خلیفہ اللہ اور میں راندۂ درگاہ! اگر آپ میرے بھرے میں آنے لگے تو صاف ظاہر ہے کہ آپ خلیفہ بننے کے ہرگز اہل نہ تھے۔ قسم لے لیجئے! بعض اوقات آپ کی حرکات دیکھکر تو میرے کان بھی کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ نفس کو خوش کرنیکی جو جو جدتیں آپ نے پیدا کی ہیں۔ قابل داد ہیں۔ لیکن قباحت جب ہو گی مجھ پر ہو گی۔"

"راستہ بھی تو آپ ہی دکھلاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "شاگرد کے کمال کی داد ہمیشہ استاد کو ملتی ہے۔"

"استاد کون؟ میں؟" شیطان ہنسکر بولا "اجی نہیں! اس میدان میں تو آپ میرے بھی کان کترنے لگے۔ 'مدر انڈیا' کے متعلق پہلے میرا بھی یہ خیال تھا کہ نسلی اور قومی

تعصب کی بنا پر لکھی گئی ہوگی۔ لیکن جب آنکھوں سے دیکھا تو ابن آدم کی جدت کی بے اختیار منہ سے داد نکل گئی"۔

"آپ داد نہ دیں"۔ میں نے کہا۔ "تو اور کون داد دیگا"۔

"بجا ہے!" شیطان بولا۔ "آپ کی قوم میں بے پردگی کی وبا جو پھیل رہی ہے اس کا ذمہ وار بھی گویا میں ہی ہوں۔ آپ کے نوجوانوں پر جس طرح الحاد کا رنگ چڑھ رہا ہے اسکی ذمہ واری بھی آپ میرے ہی سر تھوپیں گے"۔

"تو اور کیا"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں!" شیطان بولا۔ "آپ لوگوں نے ایک بات بنا رکھی ہے کہ میرے شر سے بچنے کے لئے لاحول پڑھنی چاہیئے۔ کیا کہنے ہیں اس قدر دانی کے میں تو رات دن آپ لوگوں کے لئے مارا مارا پھروں اور آپ میری خدمات کو شر کے نام سے تعبیر کریں خیر یہ ایک دنیا جانتی ہے کہ جہاں مسلمانوں کا مجمع ہو اور اُسے منتشر کرنا ہو تو اذان کہنی شروع کر دو۔ پھر دیکھیئے کس کس طرح یہ خلیفۃ اللہ کہلانے والے وہاں سے کھسکتے ہیں اجی جناب! مجھے تو شاید کسی لاحول پڑھنے والے نے خواب میں بھی لاحول سے بھاگتے نہ دیکھا۔ لیکن آپ لوگوں کو اذان کی آواز سے بھاگتے دیکھکر تو غیر مسلم بھی مذاق اڑایا کرتے ہیں۔ اب کہیئے اس کا قصور وار بھی میں ہی ٹھہرایا جاؤنگا؟"

"آپ خود کہہ چکے ہیں کہ آپ فضا بھی پیدا کرتے ہیں اور محرک بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔

"یہ میں تسلیم کرتا ہوں!" شیطان نے کہا۔ "لیکن میں جو کچھ کرتا ہوں۔ عین فطرت کے مطابق کرتا ہوں۔ آزادی کی پکار چاردانگ عالم سے اٹھ رہی ہے۔ مرد ہو یا عورت آزادی ہر ایک کا پیدائشی حق ہے لیکن ذرا اپنی قوم کی طرف دیکھئے جو ایک غریب عورت کو اسکے ایک جائز حق سے محروم رکھنے پر تلی ہوئی ہے حالانکہ جناب آدم نے حوّا سے کبھی پردہ کرنے کو نہیں کہا مجھے عورت کی بیچارگی پر ترس آیا کہ یہ اتنی خوبصورت، اتنی لطیف اور اتنی کارآمد ہو کر کیوں دم گھٹ گھٹ کر مر رہی ہے۔ تو میں نے مرد کے ہاتھوں عورت کے لئے ایک ایسی فضا پیدا کرادی۔ کہ عورت کے دل میں بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اور اسوقت جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب اسی جذبے کی کارفرمائی ہے۔ جناب! خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اور....."

"اور" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کرتی ہے۔"

یہ سنکر شیطان ہنسنے لگا۔

"فرمائیے!" میں نے پوچھا۔ "اب کون ذمہ دار ہے؟"

"سنیے!" شیطان بولا۔ "عورت آزادی کی خواہاں تھی۔ میں نے ایک خوشگوار سی فضا پیدا

کر دی ۔ مردے نے تھوڑی سی ڈھیل دے دی ۔ وہ چل نکلی ۔ اب فرمایئے میرا کیا قصور ؟ مزا تو
تب تھا جب کوئی حامیٔ دین اور مصلح قوم اسکے خلاف آواز بلند کرتا ۔ اسکے روک تھام کی تدبیر
کرتا ۔ حضرت ! معاف فرمایئے ! یہ کام آپ کے تسبیح بدست علماء کا تھا ۔ وہ چاہتے تو سب
کچھ ہو سکتا تھا ۔ لیکن جب یہ حضرت خود ہی "پردے کے مقامات" کے اختلاف میں اُلجھے
ہوئے ہوں تو اس گتھی کو کیا خاک سلجھاتے ۔ اب یہ رُوٹھمنی مشکل ہاں ! اتنا ضرور کہونگا
کہ عزت اسی کی ہے جو رسم قدیم کا پابند رہے"۔

میں نے کہا: "جانے ! آپ کی خصوصیت سے ہم پر کیوں نظر عنایت رہتی ہے"
"آپ یہ کہتے ہیں نا !" شیطان بولا ۔ "کہ نہ میری دوستی اچھی نہ میری دشمنی اچھی ! حالانکہ
جو خود عتاب میں ہو وہ کسی کا دوست ہو سکتا ہے نہ دشمن ۔ ہاں ! مذاق یا دل لگی کی بات
اور ہے"۔

"تو کیا ؟" میں نے مسکرا کر پوچھا ۔ "اس دل لگی اور مذاق کے لیئے ہم ہی رہ گئے !"
"اجی تو یہ کہیئے !" شیطان بولا ۔ "آپ تو لاحول پڑھ پڑھ کر پریشان کر دیتے ہیں
آپ سے کیا کوئی خاک دل لگی کریگا ۔ مزا تو کچھ دوسروں کو ہی چھیڑ کر آتا ہے"۔
"کبھی دیکھا تو نہیں" میں نے کہا ۔
"خوب !" شیطان نے میری طرف دیکھ کر پوچھا ۔ "اور وہ 'نوائے تلخ' لکھنے کی

آپ کو کیوں ضرورت پڑی۔"

"وہ تو محض اردو کی حمایت میں ایک مضمون تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"مضمون مت کہیئے۔" شیطان نے کہا۔ "بلکہ بم کہیئے اُسے تو۔"

"کچھ بھی سہی!" میں نے کہا۔ "لیکن آپ کو 'اُردو ہندی' کے جھگڑے سے کیا واسطہ؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی!" شیطان بولا۔ "یہ "یوّم بھاشنہ" کا شوشہ بھی تو میں نے ہی چھوڑ رکھا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ زندگی عمل کا نام ہے۔ آج کل آپ لوگ آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ کہیں کانگرس کی ڈفلی بج رہی ہے۔ کہیں جداگانہ الیکشن کی ڈونڈی پٹ رہی ہے کہیں مسلم لیگ کی نفیری بج رہی ہے۔ کہیں فرقہ وارانہ مسائل پر سر پھٹول ہو رہی ہے۔ کہیں عدم تعاون کی وبا پھیل رہی ہے۔ کہیں اکثریت کو قائم رکھنے کے لئے اچھوتوں کے قدموں پر دھرم قربان کیا جا رہا ہے۔ کہیں شہید گنج کا قضیہ ہے۔ الغرض کہیں کچھ کہیں کچھ۔ تو بھائی جان!......"

"بھائی جان؟" بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا۔

شیطان مسکرا کر بولا۔ "معاف کیجئے! محض بے تکلفی سے یہ لفظ میرے منہ سے نکل گیا۔ خیر! میں خوش تھا۔ کہ ہندوستان والوں میں زندگی کے کچھ آثار تو ہیں۔ لیکن بُرا ہو اس نام و نمود کی خواہش کا۔ آپ جانیئے۔ کل تک جو بزرگ حکومت کے خلاف

زبان اور قلم سے زہر اُگل رہے تھے۔ آج اُسی حکومت کی چوکھٹ پر جبین نیاز جھکانے کے لئے اسمبلی کے ممبر بن رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں حکمران کی ساحری۔ جب آپ کے راہبوں کا یہ حال ہے تو آپ کس برتے پر ڈینگ مارتے پھرتے ہیں تو یہ دیکھ کر کہ کام ٹھنڈا پڑا جاتا ہے۔ میں نے آپ میں سے ایک آدمی کو جو خود ستائی اور خود نمائی کے مہلک مرض میں ایک مدت سے مبتلا ہے۔ یہ مشورہ دیا کہ جناب! آپ کے "داس" آپ سے اب لنگوٹ بچاڑنے کو کہہ رہے ہیں اور ادھر آپ کے سرگباش ہونے کا وقت بھی قریب آلگا ہے۔ اگر آپ ٹھنڈے ہو کر کٹیا میں ہو بیٹھے تو پھر ارتھی کا بھی دھوم سے اٹھنا معلوم۔ نام و نمود کے لئے دنیا بھر کے پاپڑ تو آپ بیل چکے۔ لیکن ایک مدت سے دیوتاؤں کی زبان بھرشٹ ہو رہی ہے اسکی کچھ خبر لیجئے۔ آدمی ہیں سیانے بھانپ گئے کہ ہاں یہ میدان تو واقعی ابھی تک خالی پڑا ہے۔ جھٹ ہندی کے علمبردار بنکر آگے پیچھے سے لنگوٹ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور رام مہاراج کے نام پر ہندی ہندوستانی کا جسے آپ نے "بوم بھاشنہ" کا لقب دیا ہے جھگڑا کھڑا کر دیا۔ آپ جانئے! یہ مسئلہ اُس وقت جس مرحلہ پر پہنچ چکا ہے۔ اور دونوں قوموں کے تعلقات میں جو ناخوشگوار سی فضا پیدا ہو چلی ہے۔ اسکا ذمہ دار میں تو نہیں میں نے تو بڑے میاں سے ذرا مذاق کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ بڑے میاں سچ مچ ہی سٹھیا جائیں گے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں گے۔ اور پھر یہ جو آپ کے ہم مذہب اہلِ قلم

جو کسی نہ کسی وجہ سے آج زبان کے معاملے میں ہندی والوں کے ہم نوا بنے پھرتے ہیں۔ تو کیا ان سے بھی میں نے ہی یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر آزاد خیالی کی سند حاصل کرنی ہے تو ہندی والوں کی ہاں میں ہاں ملائے رکھو۔ حاجی جناب! یہ وہ لوگ ہیں جو ہمہ دانی کی ہیکل گلے میں ڈالکر نام اور شہرت کیخاطر زبان اور قوم سے غداری کر رہے ہیں۔ میں نے تو صرف ایک ادبی فضا پیدا کی تھی۔ اب اگر اُسے ناخوشگوار بنائے چلے جائیں۔ تو آپ کی مرضی۔"

یہ سنکر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا: "اسے کہتے ہیں بھس میں چنگی ڈال جمالو دور کھڑی"۔

"معاف فرمائیے!" شیطان بولا: "اسے کہتے ہیں نیکی برباد گناہ لازم! سنیئے! میں ایک مدت سے قوموں کے عروج اور تنزل کے اسباب پر غور کر رہا ہوں۔ مذہب جس کی کسی زمانے میں بہت پکار رہتی۔ اسکا رنگ اب اُتر چکا ہے آپ کے یہاں اب فیشن پرستی کا نام مذہب ہے۔ آپ کی خودداری اور غیرت تہذیب نو کی نذر ہو چکی ہے اب الحاد کا رنگ چڑھ رہا ہے اور اسکے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو آپکے یہاں علمائے دین کہلاتے ہیں اور جو مجھ سے پوچھیئے تو آپ کے قومی زوال کا باعث بھی یہی بزرگ

ہستیاں ہیں۔ آپ کے سر پر اب فیشن پرستی کا بھوت سوار ہے اور اسکے جو نتائج ہوا کرتے ہیں آپ ہر روز دیکھ رہے ہیں اچھے ہیں یا برے ہیں یہ آپ جانیں لیکن میں ان باتوں کا ذمہ دار ہرگز نہیں۔ آپ کے یہاں جسے صداقت راست بازی۔ اخلاق غیرت اور ہمت کہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں آپ نے اب شہرت کے شوالے پر بھینٹ چڑھا رکھی ہیں لیکن افسوس آپ کی وہی مثال ہے۔ کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اب ایک نسخہ میں بتلاتا ہوں آزما دیکھئے۔ اگر سو فیصدی مجرب نہ ہو تو پھر جو جی میں آئے مجھے کہہ لیجئے۔ دنیا میں اگر عزت اور آبرو سے رہنا ہے تو پھر جس کی لاٹھی اسی کی بھینس" کے اصول پر عمل کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ ع۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے! فضا پیدا ہو چکی ہے۔ صرف عمل کی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے حرکت میں برکت ہے"۔

اتنا کہکر میرا ملاقاتی اٹھا اور ہنسکر بولا۔ "اب سچ کہیئے جب سے میں بیٹھا ہوں آپ کتنے بار لاحول پڑھی"۔

"ایک بار بھی نہیں"۔

"شکریہ! اب اجازت دیجئے۔ پھر کسی روز حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ آداب عرض"۔

سیرگاہ

سیر گاہ

دنیا ایک سیر گاہ ہے!

آپ دیکھینگے کہ یہ سیر گاہیں جہاں عوام الناس بھی امرا کی طرح جب چاہیں تشریف لے جا سکتے ہیں اکثر ایسے متلون مزاج لوگوں سے آباد نظر آتی ہیں جو یا تو اپنے نفس کی بداعمالیوں سے پس خوردہ نہ تو یہ فریبِ خوردۂ محبت ہونگے۔ یا وہ بھلے آدمی ہونگے جنہیں دنیا جہاں میں گھوما گھامی کے سوا اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ یا اپنی عظمت گذشتہ کے پنشن یافتہ عہدہ دار ہونگے۔ یا وہ شریف لوگ ہونگے جنکے متعلق آج سے کوئی نصف صدی پیشتر ایک حکیم فرما گئے تھے کہ ع

کہ عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی!

اور حقیقت میں ہے بھی کچھ ایسا ہی۔ وہ لوگ جو عیش و طرب کے مزے لوٹ چکے ہوں اور دنیا کے مزے لوٹ لوٹ کر بالکل ہی نکارہ ہو چکے ہوں یا وہ تجربہ کار بزرگ جو حضرت عشق کے رموز کم و کیف خوب سمجھتے ہوں یا اللہ میاں کے وہ فرشتہ سیرت بندے جنکی کسی زمانے

میں شرافت اور انکسار دیکھ دیکھ کر ع

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی!

بار بار زبان پر آیا کرتا تھا۔ یا وہ اللہ کے پیارے جو بیوی کی کرامت سے گھر میں قدم رکھتے ہی یا وحشت پکار اٹھیں یا وہ برخوردار اور لوگوں کے نورچشم جو ماسٹر جی کی مد کے خوف سے مدرسہ سے غائب ہو جائیں۔ انہی سیرگاہوں میں آپ کو سگرٹ پیتے یا تاش کھیلتے یا جمائیاں لیتے یا منہ کھول کر ہوا پھانکتے نظر آئینگے

رہے ہمارے ادیب اور شاعر لوگ تو ان قسمت کے ماروں کو جناب بُوم کی طرح صرف ویرانہ ہی پسند ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے آج کل کے پیروں کی خانقاہوں سے دن دہاڑے ہو حق کا شور اٹھنے لگتا ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے دل کا کنول بھی اجڑے دیاروں میں ہی کھلتا ہے جہاں یہ اہل قلم حضرات فکر سخن کے لئے تشریف لیجاتے ہیں اور اگر آپ عقل کے تال صاف کر کے دیکھیں تو یہ نکتہ فوراً ریزش کی طرح آپ کے دماغ میں اتر آئیگا۔

کہ وہ ادبا، جادو بیان جنہیں شومیٔ قسمت سے دوسروں کے لئے ایک رومان خیز دنیا آباد کرنی ہوتی ہے۔ اور وہ شعراء شیریں گفتار جنہیں ہماری اور آپ کی خوش قسمتی

سے ایک دنیا کے لئے رنگ برنگ کے موچھوں والے اور بن موچھے معشوق پیدا کرنے ہوں وہ اگر ویرانے آباد نہ کریں تو ان اختراعات اور ایجادات کی داغ بیل کیسے پڑے

اکثر لوگوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ ادبا اور شاعر لوگ عموماً ایسی صحبتوں سے گریز کرتے ہیں جہاں سرمایہ دار بھونرے بھنبھناتے نظر آتے ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ اس میں "حیران" ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کی نگاہ میں یہ آپ کے اہل ثروت تو کسی قطار شمار میں ہی نہیں آتے۔ آپ جانئے! جب اس کمینے ہیں سے ایک بزرگ کسی ہندو کے خال پر سمرقند اور بخارا تک بخشنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ تو یہ کب کسی اور کو خاطر میں لائیں گے۔ یہی حال ہمارے ادیبوں کا ہے۔ دور کیوں جائیے! یہ تو کل ہی کی بات ہے کہ دہلی سے جناب شوکت صاحب بڑی ہی شان و شوکت سے ایک مزاحیہ تقریر براڈ کاسٹ کر رہے تھے۔ اور ہم بھی کہیں پاس ہی لاہور بیٹھے سن رہے تھے۔ آپ جوش جنوں نہ تو یہ جوش عبودیت سے انسان سے گھوڑا بنے بیٹھے تھے یعنی "اگر ہم گھوڑا ہوتے" تو سوال یہ ہے۔ کہ جب ایک پڑھا لکھا آدمی اسپ تازی بننے کے خواب دیکھ رہا ہو خواہ اسپ بے دم ہی سہی تو اسے اب ایسے آدمیوں کی صحبت کب گوارا ہو گی۔ لیکن شوکت صاحب نے گھوڑا بن جانے کے بعد جہاں اپنے "اسپیانہ" کمالات کا ذکر خیر کیا تھا۔ کیا اچھا ہوتا جو یہ بھی فرما دیتے کہ اگر ہم گھوڑا ہوتے تو جہاں کہیں ہندی ہندوستانی مادیان کا اجتماع

ہوتا تو مارے دولتیوں کے کُنبے کے کا مزاج درست کر دیتے۔ بہرکیف بحیثیت ایک دیرینہ نیاز مند ہونے کے ہم خدا سے بشرطیکہ خدا نے توفیق دی تو کسی روز نماز پڑھے بغیر ہی یہ دعا کرینگے کہ اللہ میاں عرب کے مشہور مشہور گھوڑوں کے سرصدقے ہمارے ایک بھائی کی تمنا جلد پوری کر دے اور جو ہو سکے تو انہیں ویلر بنا دے۔

چشم دوستاں بدشمن دل دوستاں شاد!

ہاں معاف فرمائیے! بات تو کچھ ہو رہی تھی سیر گاہوں کی اور ذکر لے بیٹھے ہم پڑھے لکھے گھوڑوں کا لیکن سیرگاہوں میں بھی اکثر گھوڑے وڑے گُھس ہی آیا کرتے اس لئے معذرت کی توچنداں ضرورت نہ تھی۔ خیر! رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت! تو جناب تذکرہ صدر مخلوقات کے علاوہ آپ کی ان سیرگاہوں میں آپ کو مختلف قوموں کی ترقی پسند چھوٹی بڑی عورات (یہ مذکرات کے وزن پر ہے) بھی نظر آئینگی۔ ان میں بیاہی ہوئی بھی ہونگی۔ اور بیاہی جانیوالی بھی ہونگی۔ کچھ بھیگی بلی کھنبا نوچے کے ٹائپ کی بھی ہونگی۔ اور کچھ شوخ بالی عمر والیاں بھی ہونگی۔ شکر کیجئے کہ کہیں بال کٹی نظر نہ آئیگی کیونکہ اگر ان ترقی پسند بیبیوں نے بال بھی کاٹنے شروع کر دیئے۔ تو آپ جانئے ملک کی ناک بھی کٹ جائے تو کچھ تعجب نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملک کی ناک ہے کہاں ملک کی ناک پر پہلے تو اسی روز سیفٹی ریزر چل گیا تھا جس روز ہندو مسلمان کا بکھیڑا پیدا ہوا تھا۔

اور پھر آج ہندی اردو کے جھگڑے نے تو رہی سہی ناک بھی کاٹ کر رکھدی ہے لیکن
بے حیا کی بلا دُور غم کرے ہماری پیزار کیونکہ بقول آتش ؔ ؎

بے حیائی سے مگر ناک نہیں کٹتی ہے !

اور آج ۱۹۳۸ء میں ملک کی ترقی کا راز تو صرف سیر سپاٹے ہی میں معلوم ہوتا ہے۔ مانا کہ ملک میں آزادی کی جنگ کا طبل بج رہا ہے۔ گو ہے پھٹا ہوا ہی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اور کیسی آزادی چاہتے ہیں جس ملک کی عورتیں آزاد ہوں اور ہو رہی ہوں وہ کبھی "غیر آزاد" نہیں کہلا سکتا۔ اور جناب ! یہ سب اسی شوقِ سیر اور سیرگاہوں کی کرامت ہے۔ کہ دیویاں دیوں سے بھی دو قدم آگے آزادی کی راہ پر گامزن نظر آتی ہیں۔ ہاں ! یہ اور بات ہے کہ ؎

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی
سنی ضرور ہے دیکھی نہیں کہیں میں نے !

اور چونکہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ ! عموماً بوڑھے بوڑھے بے علم بزرگ فرمایا کرتے ہیں اس لئے آپ بھی چھوڑیئے اس بحث کو اور چلئے ذرا نمائش ہی دیکھ آئیں کیونکہ آزادی کے کچھ روح پرور نظارے تو اسی جگہ ہی نظر آتے ہیں ۔

تُفو

ایک روز کا واقعہ عرض کرتا ہوں۔ میں کرسی پر بیٹھا مالٹا کھا رہا تھا دوپہر کا وقت تھا یعنی جس وقت مکھیاں مزاج پرسی کے لئے تشریف لے آتی ہیں اور مالٹے کھانے کا لطف بھی کچھ دھوپ میں ہی آتا ہے۔ اگر مالٹا "بلڈرڈ" ہو تو کھانے کے ساتھ ہی طبیعت میں کچھ جولانی سی محسوس ہونے لگتی ہے اور رنگا رنگ کے مضامین سوجھتے ہیں۔ یعنی خیالات! اتنے میں نوکر نے تین خط میز پر لاکر رکھ دیئے پڑھنے پر معلوم ہوا کہ لکھنے والوں کو میرے نیازمند ہونے کا فخر بھی حاصل ہے اور اسے تو میری محض خوش قسمتی ہی سمجھئے کہ ذاتی طور پر مجھے ایک سے بھی نیاز حاصل نہ تھا۔ اور عملی نیازمندی سے یہ میرے تینوں نیازمند اتنے ہی کورے معلوم ہوتے تھے۔ جتنے کہ جناب نہرو مسلمانوں کی تہذیب سے ناآشنا ہونے کا اعلان فرما چکے ہیں۔ اور اصل حقیقت ہے بھی تو یہی کہ جن لوگوں کی تہذیب چوٹی۔ لٹیا اور لنگوٹی تک محدود ہو۔ ان کے "ظرف کا لبٹڈ" ہونا کبھی باعث استعجاب نہیں ہو سکتا۔

حکایت ہے کہ شاعر مشرق کو الہام ہوتا ہے۔ اور غالباً ع

کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے!

غالباً اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا۔ کیونکہ پنڈت جی نے اپنی خالص آپ بیتی میں اسلامی تہذیب کے متعلق جو اظہارِ خیال فرمایا ہے آپ کے ذہنی ارتقاد کا آئینہ دار ہے اور سمجھنے والے خوب سمجھتے ہیں کہ ع

دل کی کیفیت ہے پیدا پردہ تحریر میں

ورنہ پنڈت جی غریب کو کیا پڑی تھی کہ آپ بیتی لکھتے لکھتے اسلام اور مسلمانوں کی گھتیاں سلجھانے بیٹھ گئے۔ حالانکہ حکمت کی کتابوں میں یہ صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ ع

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اور پھر جامعہ مصنفہ ڈاکٹر کرول باغ" صفحہ ۲۲۰ پر مرزا جی پر تنقید کرتے ہوئے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہوا ہے کہ

"پھر ان (باتوں) میں ادبی ظرافت اور طنز کے
اس قانون کی صریح خلاف ورزی ہے کہ لکھنے
والے کو ذاتی بغض و عداوت اور مذہبی سیاسی
تعصب کے اظہار سے بچنا چاہیئے"۔

تو خیر! پنڈت جی محترم کو تو شاید اس پند بر دیوار پر عمل کرنے کی فرصت نہ ہو۔

لیکن ہم اولین فرصت میں آپ کو کاربند ہوکر دکھلاتے ہیں یعنی جہاں تک معانی اور مطالب کا تعلق ہو سکتا ہے ہمارے نقطۂ نظر سے یہ تینوں گرامی نامے ایسے خودساختہ نیازمندوں کی علم دوستی اور اردو پروری کے مظہر تھے۔ جو بلغمی مزاج اور لاابالی طبیعت کے ساتھ ساتھ "بانیائی" خصلت بھی رکھتے ہوں۔

ممکن ہے کہ آپ اس "بانیائی" کا مطلب نہ سمجھ سکیں۔ اس لئے عرض کیا ہے کہ بُوم بھاشہ ہے یعنی وہی جسے اچھوت سدھار والوں کی زبان میں ہندی ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اور چلتی اُردو میں ایسے آدمی کو بانیا صفت بزرگ کہتے ہیں۔ جو لین دین کا معاملہ خوب سمجھتا ہو۔ لیکن بدقسمتی سے یہ لین دین کا لفظ کچھ اسقدر وسیع المعانی واقع ہوا ہے کہ اب اگر ہم اسکی شرح لکھنے بیٹھیں۔ تو جانے کسی بھلے مانس کے اعمال کی طرح کئی پوتھیاں سیاہ ہو جائیں۔ اور پھر بھی رام جی مہاراج کی کرپا سے آپ کے پلّے خاک نہ پڑے۔ آپ جانئے! کہ ایک علم فہم آدمی کے نقطۂ نظر سے لین دین کا اطلاق ہر اس چیز پر ہو سکتا ہے جو ایک وقت کسی سے لی جائے اور دوسرے وقت اسی طرح یا کسی اور شکل وصورت میں واپس کی جائے۔

تو خیر! یہ خطوط لانے کو تو جناب شرف صدور لے آئے لیکن آپ کے ہی سر کی قسم!

اگر پڑھ لینے کے بعد کہیں وہ ہمارے قابو آجاتے تو چھٹی کا دودھ تو ہم انہیں ضرور یاد دلا دیتے۔ خیر (لکھنے والوں کا ختم نہیں) اگر لینے کے بعد ہماری نورانی ہونے والی پیشانی پر کسی تلون مزاج محبوب کی تیوری کی طرح تین ساڑھے تین بل یعنی شکن تو ضرور پڑ گئے۔ لیکن ساتھ ہی ملٹے کی ایک پھانک جو گلے میں اٹکی تو زبان سے انا للہ کی بجائے بے اختیار ع

غافل آداب سے یہ اہل قلم کیسے ہیں!

نکل گیا۔

تو آپ جانئے! ان تینوں خطوں کو نہ تو ہم حدیث دلبراں کا لقب دے سکتے تھے۔ نہ نالہ عشاق سے تشبیہ دی جا سکتی تھی نہ ہر مجنوں کی فریاد کے نام سے تعبیر ہو سکتے تھے۔ اور نہ بوم بھاشہ عرف ہندی ہندوستانی کے الاعبان کے نسلی نعرہ بندے ماترم سے ان کا کچھ رشتہ ناطہ معلوم ہوتا تھا۔ اور نہ ہی کسی مجذوب کی بڑ ہی کہہ سکتے تھے۔ ہاں! اگر کسی مینٹل ڈیبزیر یہ ہاسپٹل یعنی شفا خانہ حیوانات ناطق واقع ضلع لاہور قسمت جالندھر کے عالی دماغ مکیں کی بزلہ سنجی کہا جائے تو کچھ اتنا غلط نہ ہو گا۔ اور پھر حکیم ابن بطوطہ اپنے طوطا نامہ ارے معاذ اللہ! اپنے سفرنامہ میں لکھ گئے ہیں کہ ع

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند!

اس لئے ممکن ہے کہ خدا کے ان سلیم الطبع بندوں نے اسی حکیمانہ قول کو بہ نظر رکھتے ہوئے یہ نوازش نامے جنہیں پڑھکر ہم نے ایک آہ بھر کر کہا تھا کہ لیجئے اب ع

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے کلام آتے ہیں

ہمارے نام "زد نذ" کر دیئے ہوں لیکن معاف فرمایئے! ان رنجش کے کلاموں میں ایک سخن گسترانہ بات آپڑی ہے یعنی اصل حکمت کی بات تو یہ ہے کہ جب آپسمیں کھچ کھچ پنخ پنخ ہو چکی ہو یعنی بقول جناب عشرت رحمانی صاحب ؎

کچھ ہم کھنچے کھنچے رہے کچھ وہ کھنچے کھنچے
اور:۔ اسی کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

تو جب از سر نو رنجش کے کلاموں کا سلسلہ شروع ہو جائے تو مطلب صرف یہی ہوگا کہ ع اب مناسب ہے یہی کچھ تو بڑھے کچھ میں بڑھوں!

اور جب اسی طرح بڑھتے بڑھتے آخر بھرت ملاپ ہو جائے تو پھر ع

درد دل کی شکایتیں تو یہ!

صورت نادر اختیار کر لیتی ہیں اور آخر دل صاف ہو کر یہ کھٹکا ہی نہیں رہتا کہ ع

پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے پلنگ تجھ بن پلنگ ہو کر

اور اس قدر مراحل طے ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہے کہ ؎

وقت فرصت جو تم نے سونپی تھیں

اور ساتھ ہی سینے سے لگا کر یہ بھی دکھا دے کہ دیکھ لو

وہ مری بیقراریاں نہ گئیں

تو اسے بس کسر نفسی ہی جانئیے۔

ارے معاذ اللہ! ہم تو اپنے نیازمندوں کے متعلق جو انشاء اللہ انہی دنیاداروں کے سر صدقے کچھ عرصہ تک تو "بزمِ فروغِ اردو" بنے رہینگے اور پھر وہی سکوت تھا پہ وہ دار جسکا معاف فرمائیے! اگر آپ کو ہماری روشنئ طبع کی مجبوریاں (جسکی بدولت ہم اصل موضوع سے بھٹک کر ادھر ادھر ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں) معلوم ہوں تو آپ اپنے اپنائے ہوئے نہیں) ہو کر کبھی مرزا یگانہ نہ بنیں لیکن اتنا تو شاید آپ بھی تسلیم کرینگے کہ یہ جخ جخ پخ پخ محض اللہ کی دین ہے اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں تو جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے! ہم کوئی مرزا سودا تو ہیں نہیں کہ جس سے بگڑے۔ ابے او غنچہ! لا تو ہمارا قلمدان! کہکر آستینیں چڑھالیں اور حالت یہ ہو کہ غنچہ کے قلمدان لاتے لاتے یارانِ قافلہ تو منزل پر جا پہنچیں اور ہم صرف بیٹھے ریزولیوشن پاس کریں اور دیکھنے والے اتنی سند تو دیدیں کہ ہاں

آپ بھی

لہو لگا کے شہیدوں میں مل گئے!

اور جناب! ہمارے لئے اب سوائے ریزولیوشن پاس کرنے کے اور کوئی کام بھی تو نہیں اور ہمارے اور آپ کے خدا نے اگر چاہا تو قوم کے صدقے میں ۳۱ ردسمبر سنہ ۱۹۳۸ تک اتنے ریزولیوشن پاس کر دینگے کہ کبھی ایک کو عملی جامہ پہنانے کی حشر تک بھی نوبت نہ آئے۔

لیجئے اب ہمیں اجازت دیجئے۔ سوا دس بج چکے ہیں اور اسی وقت سے ہماری نیند کی ابتدا شروع ہوتی ہے۔ اس لئے اب نیند کو لبیک کہنے کی تیاری کرینگے۔ خدا نخواستہ کسی کتاب کا دیباچہ تو ہمیں لکھنا نہیں کہ اب ختم ہی کر کے اٹھیں۔ لہٰذا اب اگر قضا و قدر کو منظور ہؤا تو کل بات ختم کر دینگے۔ نیت شب بخیر!

سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی!

وہ مالٹے کھانے سے طبیعت میں جو جولانیاں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اب استراحت فرما لینے کے بعد چونکہ سرد پڑ چکی ہیں اس لئے شب گذشتہ کے افسانے کو آج پہلی صحبت میں ختم کئے دیتے ہیں۔ تو آپ جانئے کہ ہمیں خط لکھنے والے وہ اہل قلم بزرگ تھے جو کسی خدائی فوجدار کی طرح اردو کی حفاظت اور خدمت کا بیمہ کرائے بیٹھے ہوں۔

یعنی وہ صاحب کرامت لوگ جنہیں ہندوستانی میں مدیر اور اردو میں ایڈیٹر

کہتے ہیں اور عرف عام میں نیاز مند تخلص کرتے ہیں اور ہم ایسے بیگار میں پکڑے ہوئے لکھنے والوں کے لئے ان کی نوازشات زبردست کے ٹھینگے سے کچھ کم نہیں ہُوا کرتیں ۔

ان اصحاب ثلاثہ کو ہم سے شکایت ہے کہ ہم ان کے لئے کچھ نہیں لکھتے اور اگر آپ ہماری مجبوریاں ملاحظہ فرمائیں تو ظاہر کی آنکھ سے ہی ساڑھے سولہ آنے ہم آپ کو صراطِ مستقیم بنے نظر آئینگے۔ قصّہ یہ ہے کہ ان رسائل میں جس قسم کے ادبی اور علمی جواہر پارے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے تو ہمیں یہ بُوم بھاشہ والے ہی کچھ صادق ہیں اپنے قول کے غالب خدا گواہ بنے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

ایک نیاز مند اپنے گرامی نامے میں کمال ہمدردی سے وعدہ فرماتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو وہ بہ یک جنبش "قُون ٹن پن" ہمیں بانس پر ایسے معاذ اللہ! آسمان پر چڑھا سکتے ہیں یا بٹھا سکتے ہیں۔ تاکہ ہم اودھر اودھر سے مقدس بیروں کی گھٹلیاں اُٹھا اُٹھا کر عالمِ اسفل والوں پر پھینکا کریں ۔

اسے ایک اتفاق ہی سمجھئے کہ دو ایک روز ہوئے انکا ایک خاص نمبر ہمارے نام آیا تھا۔ اور جناب! اس میں ایسے ایسے زود اثر عمل بتلائے گئے تھے کہ ایک بیر

سال کروٹ لیتے ہی عاقل اور بالغ نوشہ بن جائے۔ آپ جانیئے! اس علمی اور ادبی رسالہ کے ہر صفحہ پر دنیا بھر کی مقوی معجونوں، شباب آور مرکبات اور کایا پلٹ گولیوں، ہزاروں قسم کی طلاؤں جن میں پان باندھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور ضرورت سے دو گھنٹے پہلے پاؤ بھر دودھ سے ایک گولی کھا کر راجہ اندر کے اکھاڑے کی سیر کرانے والی ادویات کے اشتہارات کے علاوہ تیر بہدف تعویذوں اور عملیات کی قیمت اور ملنے کے پتے بھی مفصل موجود تھے اور جناب تعویذ بھی پھر ایسے موذی کہ ادھر آپ نے ایک روپیہ چار آنے ہدیہ کے دے کر تعویذ بازو پر باندھا۔ اور ادھر حضرتِ معشوق "میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں" کہتے ہوئے آپ کی زنجیر در کھڑکانے لگے۔ اور ہاتھ باندھ باندھ کر اور اپنی ستواں ناک رگڑ رگڑ کر کہے کہ آپ کا عشق مستقل ہو یا غیر مستقل لیکن میں تو آپ کا داس بن چکا۔ اب چاہے مجھے بغل میں دبائے رکھئے چاہے آل انڈیا اگزیبیشن بنا دیجئے!

اب دوسرے نیاز مند کی سنئے! یہ حضرت بھی کوئی پیر جی کی دعا برکت سے لمبے تڑنگے فاضل آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ بھیا! کس خیال میں ہو یہ افسانہ نویسی چھوڑو۔ اور خدا اگر توفیق نہ دے تو ہمارے لئے کوئی ڈرامہ لکھو لیکن ہو صرف پونے ایکٹ کا۔ پھر دیکھیو کہ ادھر ہم یہ ڈرامہ شائع کریں اُدھر جنوبی ہندوستان کی ساری

کی ساری مس نما ایکٹرسیں آپ کو اپنے جھرمٹ میں لینے کو نہ اٹھ دوڑیں تو ہم جھوٹے۔

ابجی توبہ کیجئے! کسی کی مجال ہے جو آپ کو جھوٹا سمجھے۔ جو رسالہ ایکٹرسوں کی تصاویر سے پکچر البم بنا ہو اور جسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہو کہ اگر داؤ لگے تو کسی ایکٹرس کے نام سے اوّل تو دو غزلہ نہیں تو ایک غزل تو ضرور موجود ہو گی۔ اسکے ایڈیٹر صاحب اگر بات کے دھنی نہ ہوں گے تو کیا عالم جی مہاراج ہوں گے۔ جن کی نیک نیتی پر "پنڈت جی" مہاراج خدا کے نام لئے بغیر صاد کرنے کو اٹھ دوڑے تھے۔

اب رہا تیسرا محبت نامہ تو یہ ایک ایسے ہندی فاضل آدمی کی تحریر معلوم ہوتی ہے جنہوں نے شکمِ مادر ہی میں شاید رسالہ بازی کرنیکی ٹھان رکھی تھی۔ فرماتے ہیں کہ ایک مدت سے ایک رسالہ نکالنے کو دل چاہ رہا ہے۔ جو آپ اپنی نظیر ہو لیکن ملک کی اقتصادی حالت کچھ ایسی ہو رہی ہے۔ کہ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہاں! اگر آپ ایسے صرف ایک سو ادب نواز آدمی صرف پانچ پانچ روپے جو رسالہ کا سالانہ اشتراک بدل ہوگا پیشگی بھیج دیں تو ہم ملک اور قوم کی خدمت کا بیڑا اٹھانے کو تیار بیٹھے ہیں۔

بیشک! رسالہ تو بے نظیر ہو یا نہ ہو۔ لیکن آپ بدرجہا بہتر سے کم نہیں۔

تو جناب! جب اُردو کو ایسے ایسے پاسباں مل چکے ہوں، اور مل رہے ہوں تو پھر ہندی والوں کے یہاں گھی کے چراغ کیسے نہ جلیں۔

نقوش بر تو اے قسمت برج بھاشہ نقوش!!

اردو ہندی

فہرستِ مضامین

بنام

جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی

بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی (علیگ)

اُردو ہندی کا قضیہ

رسالہ زمانہ بابت ماہ جولائی ۱۹۲۵ء میں میرے ایک عزیز دوست کا "اردو ہندی قضیہ" کے عنوان سے ایک بہت عالمانہ اور ادیبانہ مضمون میری نظر سے گذرا۔ جو میرے خیال میں انہوں نے کسی تعصب آمیز فضا سے اثر پذیر ہو کر لکھ مارا ہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولینا تاجور نے کبھی کسی موقع پر ادبی دنیا میں بھی کچھ اس قسم کی ڈینگ ماری تھی۔ کہ ہم "حجازی اُردو" سے ادبی دنیا کے اوراق کو گندا نہ ہونے دینگے۔ گو اسوقت تک ادبی دنیا میں جو پنجاب میں کبھی اعلےٰ درجہ کا رسالہ متصور ہوتا تھا۔ یہی "حجازی اردو" جلوہ نما نظر آتی ہے۔ مسلمان لکھنے والے تو رہے ایک طرف اردو کے ہندو ادیبوں[1] اور شعرا

[1] محض اپنے مہربان کے خوف سے ادیب کی جمع ادیبوں لکھ رہا ہوں۔

کے قلم سے بھی ایسے ایسے لطیف مضامین اسی "حجازی اردو" میں نکل رہے ہیں۔ کہ زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ آج میرے دوست کو بھی اسی "عربی" کا رونا ہے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"مگر آپ یہ بتائیے کہ عام فہم اور ہندو مسلمان کی مشترکہ زبان کے مروجہ لفظوں کو نکال کو عربی لفظ ٹھونس کر آپ نے ہندوؤں کو ملک کی واحد مشترکہ زبان سے کیوں محروم کر دیا۔"

آپ جانئے! اصل بیر تو انہیں عربی غریب سے ہے آپ اتنا غور تو فرما لیتے کہ زبان بنتی کس طرح ہے اسمیں لطافت اور دلکشی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ سوچئے تو سہی! اردو زبان کس طرح وجود میں آئی۔ پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے؟ ولی دکنی کے زمانے میں اسکی کیا شکل و صورت تھی۔ اور آج دورِ اقبال میں اسکی کیا حالت ہے۔ پہلے عام فہم اور دلکش تھی۔ یا اب لطیف اور جذبات سے لبریز نظر آتی ہے۔ یہ ترقی ہوئی کس طرح؟ پھر اتنا غور تو فرما لیا ہوتا کہ اردو اور ہندی کا مقابلہ ہی کیسا؟ حیران ہوں کہ میرے مہربان یہ کیسے بھول گئے۔ کہ ہندی کی ترویج پر جو زور لگایا جا رہا ہے۔ محض مذہبی تعصب کی بنا پر ہے۔

میرے محترم دوست نے صحیح فرمایا ہے۔

"وہ زمانہ گیا کہ ہندو عربی فارسی جانتے تھے ...."

پھر ارشاد ہوتا ہے! "ادھر انہوں نے اسکو چھوڑا ادھر مسلمانوں نے اردو میں

....

نہ صرف نئے عربی الفاظ ٹھونسے بلکہ یہ بدعت شروع کر دی کہ ان لفظوں کو جو عرصہ دراز سے اردو میں داخل تھے۔ نکال کر پھینک دیا اور انکے بدلے عربی الفاظ ٹھونس دیئے"۔

دیکھ لیجئے! ہر جگہ عربی کو ہی کوسا جا رہا ہے۔

آپ صاحب مسلمانوں پر مذہبی تعصب کا الزام لگا رہے ہیں اور وہ بھی اپنے ادیبانہ رنگ میں۔ حالانکہ مذہبی تعصب اس "ہندو دانی ذہنیت" میں مضمر ہے جس نے ہندوؤں کو ہندی ایسی فرسودہ زبان کی حمایت میں اور اردو زبان کی مخالفت پر کھڑا کر دیا ہے۔ اور گاندھی سے لیکر ایک جاہل ہندو بھی ہندی کو ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

میرے عزیز دوست نے مثال کے طور پر سب سے پہلے "ایڈیٹر" کا لفظ

لیا ہے۔ آپ کو یہ شکوہ ہے کہ "ایڈیٹر" کی جگہ "مدیر" کیوں استعمال ہونے لگا ہے اور اسکے مجرم مولوی قرار دیئے گئے ہیں۔ مان لیا کہ "ایڈیٹر" کی بجائے "مدیر" محض کاوش سے استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن سٹیشن۔ بٹن۔ لالٹین۔ پلیٹ فارم۔ گارڈ۔ انجن۔ بریک کالر۔ ٹکٹائی۔ کوٹ۔ پلیٹ۔ نب۔ یو پی وغیرہ سینکڑوں انگریزی الفاظ جو آجتک اردو زبان میں "گھسے" ہوئے یا "ٹھنسے" ہوئے ہیں۔ مولویوں نے انکی بجائے عربی الفاظ کیوں "ٹھونس" نہیں لئے۔ کیا ان الفاظ کے لئے عربی الفاظ موجود نہیں؟ ہیں اور ضرور ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ اردو کے حامیوں نے انہیں استعمال نہیں کیا۔ بندہ پرور! کسی زبان میں ایک غیر زبان کا صرف وہی لفظ "ٹھونس" لیا جاتا ہے۔ جو زیادہ موزوں ہو جس سے زبان میں خوبصورتی اور لطافت پیدا ہو۔ ذرا خدا لگتی کہیئے! کیا "ایڈیٹر" میٹھا اور موزوں لفظ ہے۔ یا "مدیر"۔ یا "مدیر" غریب سے آپ کو محض اس لئے کاوش ہے کہ یہ عربی ہے جسے آپ کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔

اسی طرح "تھرمامیٹر" زیادہ پسندیدہ لفظ ہے یا "مقیاس الحرارت" اور پھر یہ دو عام فہم الفاظ ہیں جنہیں ہر کوئی سمجھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسکی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو۔ زبان ہمیشہ اسی طرح ترقی کیا کرتی ہے۔ کہ جب کوئی غیر زبان کا موزوں لفظ ملے تو اُسے اپنی زبان میں جذب کر لیا جائے۔ اقوام عالم اسی

اصول پر گامزن ہیں۔

واقعی عثمانیہ یونیورسٹی" کا یہ بہت بڑا جرم ہے کہ وہ اردو کی ایک ایسی لغت تیار کر رہی ہے جس میں بقول میرے محترم

"ہزاروں عربی الفاظ اردو میں لائے جائینگے"

میرا کہا مانئے ہاتھوں ہاتھ ایک اور فتوٰی جاری کر دیجیئے۔ کہ چونکہ عثمانیہ یونیورسٹی اُردو کی ایک ایسی لغت تیار کر رہی ہے جس میں حضور رسولِ عربی صلعم کی مادری زبان عربی کے ہزاروں الفاظ اردو میں لائے جائیں گے جس سے ہندو دوستوں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے اس لغت کا خریدنا مطالعہ کرنا چھونا یا دیکھنا قطعی حرام ہے! ع

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں!

اردو کے حامیوں کو بھی میرے کرم فرما نے ذرا 'رگڑ' دیا ہے۔ لیکن محض بے تکی باتیں کہہ دینے سے اس قسم کے مسائل حل نہیں ہؤا کرتے ملک میں اردو اور ہندی کے حامیوں کے درمیان جو رسہ کشی ہو رہی ہے اسکی اصلی وجہ کیا ہے۔ ہندو

بھائیوں نے یو۔پی میں کیوں ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کروالیا ہے اور آج نوبت
یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ میرے دوست کے الفاظ میں
"اس کا کورس بھی اردو رسم الخط میں مرتب ہوگیا ہے"۔
پنجاب میں ہندی کا پرچار کیوں کیا جارہا ہے کیا اسکی صرف یہی وجہ ہے کہ مسلمان
اردو میں عربی کے الفاظ "ٹھونسے" چلے جاتے ہیں۔معاف فرمائیے! ہر ذی شعور آدمی
گو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان آپ کے استدلال اور اس انوکھے نظریہ سے اختلاف
ہوگا۔ اصل وجہ تو صرف یہ ہے کہ ہندو اپنی ذہنیت سے اسقدر مجبور ہوگیا ہے کہ وہ
اب اس زبان (اردو) سے بھی بیزاری کا اظہار کررہا ہے۔جو ایک مدت سے ملک کی
مشترکہ زبان تسلیم ہورہی ہے۔ہندو چونکہ ہندوستان کا صرف ہندو کو ہی باشندہ
سمجھتا ہے اور مسلمان اسکی نگاہ میں ملیچھ ہے اس لئے وہ اس زبان کو کبھی قبول نہیں
کرسکتا۔جو مسلمانوں کے نام سے منسوب ہو اور یہ ایک ایسی تنگ نظری ہے جس کا
علاج نہیں۔ الفاظ کی بحث اگر کہیں ہندوؤں میں ہے بھی تو وہ بھی خوئے بدرا بہانہ بسیار
والی بات ہے۔رہی یہ بات کہ اس کا کورس بھی اردو رسم الخط میں مرتب ہوگیا ہے اور
میرے دوست کو
"مستقبل قریب میں ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار پاتی نظر آتی ہے۔۔۔۔"

نکرہر کس بقدر ہمت اوست والی بات ہے اردو کے حامیوں میں اگر غیرت اور حمیت ہوگی تو وہ اپنے بچوں کو ہرگز ایسی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ دینگے۔ جیسے میرے دوست کے الفاظ میں

"اردو اور ہندی کے ادیب غلط کہیں گے"۔

اور جو لوگ حقیقی معنوں میں اردو کے ادیب متصور ہوتے ہیں۔ وہ تو اسے قیامت تک بھی قبول نہ کرینگے۔

محترم نے اُردو میں غیر موزوں عربی الفاظ (جیسے ایڈیٹر کی بجائے مدیر) ٹھونسنے" کی پاداشں میں ادیبوں کو بھی لتاڑ دیا ہے۔ جانے آپ کا روئے سخن کن ادیبوں کی طرف ہے۔ لیکن جہانتک میرا تجربہ ہے اردو کے ادیب اس گناہ سے اتنے ہی پاک ہیں جتنا کہ اردو کے ہندو اخبار نویس ایسے مجرم مجھے بھی اکثر رسائل دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اور میں اکثر افسانوں میں ہندی کے موزوں الفاظ بھی موجود پاتا ہوں۔ میں نے خود اس وقت تک دوسو سے کچھ اوپر ہی افسانے ملک کے سامنے پیش کئے ہیں اور جہاں کہیں مجھے کوئی موزوں ہندی لفظ ملا ہے۔ میں نے اسکے استعمال سے کبھی گریز نہیں کیا لیکن میں خدا کا شکر گذار ہوں کہ میرے دل میں عربی الفاظ کے خلاف کوئی کاوشں نہیں

اور میں اردو کا ایک خادم ہونیکی حیثیت سے یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا کہ زبان میں ایسے الفاظ ٹھونس دیئے جائیں۔ جو بولنے میں ثقیل ہوں اور سننے میں کرخت معلوم ہوں۔ اسی طرح سے میں یہ ہرگز تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ "اردو کے حامی" کاوشس سے عربی الفاظ اردو میں ٹھونس رہے ہیں۔ بلکہ یہ ان ادیبوں کی لطافتِ مزاج اور علم دوستی کا ثبوت ہے کہ وہ غیر زبان کے موزوں الفاظ سے اپنے ملک کی مشترکہ زبان کو مالا مال کئے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح مجھے ہندوؤں سے بھی ہرگز شکایت نہیں۔ کہ وہ جہاں تک ان سے بن آتا ہے۔ ہندی اور سنسکرت کے ثقیل اور ناگوار الفاظ اردو میں بھرتی کرکے اس غریب کی شکل وصورت بگاڑ رہے ہیں۔ جب وہ زندگی کے کسی میدان میں بھی مسلمانوں سے اشتراک عمل کرنا پسند نہیں کرتے۔ تو پھر اپنی علیحدہ زبان بنانے پر کیوں زور نہ دیں۔

موسیٰ بہ دین خود عیسیٰ بہ دین خود!

لیکن ملک میں صرف وہی زبان مقبول ہوگی۔ جسکے ادا کرنے میں آسانی ہو۔ سمجھنے میں آسانی ہو اور لکھنے پڑھنے میں آسانی ہو۔ اسی طرح ادیب اور شاعر بھی اسی زبان کی سرپرستی کرینگے۔ جس میں لطافت اور دلکشی ہو۔

اردو ہندی کا قضیہ صرف ہندوؤں نے پیدا کیا ہے جس طرح انہوں نے اپنی

اکثریت کے بل پر یو۔ پی میں زبان کے معاملے میں مسلمانوں کو زک دی ہے اسی طرح اب وہ یہ چاہتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو تمام ملک میں زبان کے معاملہ میں زک دیکر میرؔ و مرزا کی زبان کی جگہ وید وں اور پنڈتوں کی زبان جاری کر دیں۔ اور اسکی اصل وجہ وہ مذہبی تعصب ہے۔ جس نے ملک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ شکر کا مقام ہے کہ گائے اور پیپل کی طرح ہندی نے کسی دیوی کا روپ نہیں دھارا۔ ورنہ ممکن تھا کہ ہندی ماتا کے لئے بھی خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ وہ لوگ جو ہندی اور اُردو کی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں محض وقت ضائع کر رہے ہیں۔ جب ملک میں یگانگت سے اتفاق پیدا ہوگا تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائیگا +


فارسی متن

نوائے تلخ

دسمبر ۱۹۳۵ء کے رسالہ "شاہکار" میں "بزم تخفیق" کے ماتحت جناب منشی پریم چند صاحب کا ایک مضمون "ایک گذارش" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ "گذارش" حقیقت میں "ہندی" کی حمایت تھی اور ادیبانہ رنگ میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑے گئے تھے

مولوی شاہد احمد صاحب بی اے دہلوی مدیر ساقی نے منشی جی کی گذارش پر اظہار خیال فرماتے ہوئے "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" کے مدیر صاحبان کو توجہ دلائی تھی۔ لیکن افسوس ہے۔ کہ معزز مدیر ساقی کو ان دونوں "اردو نواز" حضرات سے جو توقع تھی - پوری نہ ہوئی۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ اردو کے تمام رسائل اس ضروری مسئلہ کیطرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ وہ لوگ جو اردو کی خدمت کا ڈھونگ رچائے بیٹھے ہیں۔ ان کا اولین فرض یہ ہے۔ کہ وہ برادران وطن کی معاندانہ کوششوں سے اردو کو محفوظ رکھنے کے لئے عملی قدم اٹھائیں۔ کسی پرچے کی ادارت کے یہ معنی نہیں ہوا کرتے۔ کہ چاروں کھونٹ سے مضامین فراہم کر کے ہر مہینے ایک رسالہ شائع کر دیا جائے۔ بلکہ ایڈیٹر کا سب سے بڑا فرض تو یہ ہوا کرتا ہے۔ کہ جس زبان میں وہ اپنا رسالہ شائع کرتا ہے۔ اس زبان کی حمایت میں خود کچھ لکھے۔ اور جو خود لکھنے کی توفیق نہ ہو۔ تو پھر دوسروں سے ہی اس موضوع پر مضامین

لکھوا کر شائع کرے۔ کیونکہ اس نازک موقع پر جو لوگ خاموشی سادھ بیٹھتے ہیں ان کے متعلق یہ گمان ہونا یقینی ہے۔ کہ وہ بھی معترض قوم کے ہم خیال ہیں۔

میرے عزیز دوست جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بھی اردو ہندی کا قضیہ" کے عنوان سے ایک عالمانہ مضمون زمانہ میں شائع کرایا تھا۔ اور غالباً کسی مصلحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو زبان اور اس غریب کے حامیوں کو کچھ کوسنے دئے تھے۔ چونکہ یہ تلخ مضمون ایک ایسے دوست کی طرف سے تھا جس سے مجھے ارادت قلبی ہے۔ اس لئے میں نے اس کا جواب دیا۔ جو نیرنگ خیال میں شائع ہوا۔ مرزا صاحب تو غالباً میری کم سمجھی کو مدنظر رکھتے ہوئے خاموش رہے۔ لیکن کسی گپتا صاحب ایم اے نے تاؤ میں آکر میرے مضمون کا جواب "نیرنگِ خیال" میں ہی شائع کرایا مضمون لکھنے والے چونکہ ایک ایم اے واقع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مضمون بھی بہت بلند پایہ ہوگا۔ لیکن افسوس کہ جناب میرزا ادیب صاحب بی۔ اے مدیر رسالہ "ادب لطیف" نے جناب گپتا صاحب ایم۔ اے کے مضمون کا کچھ اس لطف و مدارات سے جواب دیا کہ میرے لئے کچھ مزید عرض کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہاں اس بات میں میں بھی میرزا ادیب صاحب کا ہمنوا ہوں۔ کہ گپتا صاحب غالباً میرے مضمون کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ اگر آج حق بات کہنی تعصب ہے۔ اور ایک ایسی زبان کی حمایت میں کچھ لکھنا۔ جس زبان اور جس رسم الخط کی بدولت ایک مسلمان ہی نہیں۔ بلکہ سینکڑوں

ہندو اہل قلم شہرت اور ناموری حاصل کر چکے ہیں۔ اگر یہ تنگ نظری ہے۔ تو جناب پھر میں بھی متعصب میرا قلم بھی متعصب، تم میرے مضامین بھی تعصب سے لبریز اور وہ رسائل بھی متعصب جو اس قسم کے مضامین شائع کرنے کی جرأت کریں۔

آمدم برسر مطلب منشی پریم چند صاحب کی "ایک گذارش" سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سیّد حسن ریاض صاحب نے "غم تنہائی" کے عنوان سے "شاہکار" میں ایک مضمون شائع کرایا تھا سید صاحب کا مضمون تو میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن منشی جی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّد صاحب نے غم تنہائی کے پردے میں ہندو مسلم نفاق کا رونا بھی رویا ہے۔ اور ایک طبع سلیم رکھنے والے کیطرح اس نفاق کی تباہی خیز خلیج کو وسیع کرنے کا شکوہ برادران وطن سے کیا ہے۔ اور موجودہ بے اتفاقی کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے ایمانداری کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے۔ کہ :-

"ہندی زبان اور رسم الخط کے احیاء کی کوشش اس پُرخطر راہ کی آخری منزل ہے۔"

سیّد صاحب کے اس خیال پر جو ایک کھلی حقیقت ہے۔ منشی جی فرماتے ہیں :-

اس خیال پر مجھے کچھ گذارش کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ باوجود تمام عمر اردو لکھنے اور پڑھنے اور اپنی عمر کے ابتدائی دس سال

فارسی پڑھنے کے باوجود میں بھی ہندی زبان اور رسم الخط کے احیاء
کی کوشش میں مصروف ہوں۔"

"ہندی اردو کا قضیہ" کے عنوان سے جو مضمون میں نے لکھا تھا۔ اس میں
میں نے کھلے الفاظ میں یہ عرض کر دیا تھا۔ کہ اردو ہندی کا موجودہ قضیہ
محض ایک سیاسی سوال ہے۔ اور اس کی دلیل یہ دی تھی۔ کہ :-

" ہندو چونکہ مسلمان کو ہندوستان کا باشندہ نہیں سمجھتا۔ اس
لئے وہ اس زبان سے بیزاری کا اظہار کرنے لگا ہے جو مسلمانوں
سے منسوب ہو رہی ہے۔"

اور آج میں پھر ایک بار یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ ہندی اردو کی موجودہ آویزش جس کی داغ بیل صرف برادران وطن نے ڈالی ہے۔ خالص ایک پولٹیکل مسئلہ ہے۔ جس زمانے میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت تھے۔ ملازمت کے سوال یا کسی اور سیاسی تفوق کی بنا پر ان دونوں قوموں میں اختلاف ہو گیا ہو۔ تو کچھ بعید از قیاس نہیں۔ لیکن زبان کا مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ اور آج وہ مسلمان اہل قلم جو محض اپنی نیک نیتی اور ملتِ ابراہیمی کی مشہور وسیع المشربی کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ اردو ہندی کے سوال کو "سیاسی سوال" تسلیم کرنے سے گریز کر رہے

ہیں۔ قوم اور زبان کے مفاد کے خلاف کر رہے ہیں۔

جناب منشی پریم چند صاحب کو ہی دیکھ لیجئے۔ کہ جس زبان اور جس رسم الخط کی بدولت آپکی شہرت کو چار چاند لگے آج اس زبان اور اس رسم الخط سے ہی بیزار بیٹھے ہیں ؎

فریاد کہ ناخدائے کشتی!

کشتی کو مری ڈبو رہے ہیں؟

اور اس بیزاری کی وجہ بھی سن لیجئے :۔

"میرے خیال میں ہندوستان میں زبان اور رسم الخط کے۔ مسئلہ کو ناگری رسم الخط سے ہی حل کیا جا سکتا ہے"

لیکن سوال یہ ہے۔ کہ "یہ خیال" پیدا کب سے ہوا۔ اور وہ کونسی ضرورت تھی۔ کہ آپ نے اپنی عمر عزیز کے دس سال فارسی پڑھنے میں صرف کر دئے۔ اور ہندی کی تحصیل کی کیوں کوشش نہ کی۔ جس وقت آپ نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ کیا اس وقت آپ کو اردو زبان کی مشکل پسندی اور اردو رسم الخط کی خامیوں کا خیال نہ آیا۔ آپ ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے۔ اور ہندو معاشرت کے سائے میں پروان چڑھے۔ یقیناً آپ کے بزرگوں میں سے کسی نہ کسی کو ہندی سے بھی کچھ شغف ہو گا۔ اور جو نہ بھی ہو۔ تو پھر بھی کبھی نہ کبھی آپ کو پنڈتوں اور پروہتوں سے واسطہ پڑتا ہو گا۔ اور ان کی زبان سے

آپ کو سنسکرت اور ہندی کے الفاظ سننے کا موقع بھی ملتا ہوگا۔ تو کیا آپ بتا سکتے ہیں

کہ جب آپ کے خیال میں" ہندوستان میں زبان اور رسم الخط کا مسئلہ ناگری رسم الخط

سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ تو آپ نے اردو کو کس مصلحت سے نوائے ا۔ اور اسے اظہار خیال

کا ذریعہ کیوں بنایا۔؟

منشی صاحب فرماتے ہیں :-

اردو رسم الخط کا رواج عام طور پر پنجاب اور صوبۂ متحدہ کے باہر نہ

ہو سکا۔"

مان لیا۔ کہ یہ استدلال بھی درست ہے۔ لیکن یہ تو فرمایئے۔ کہ آپ سے کس حکیم نے کہا

تھا۔ کہ آپ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کے ہوتے ہوئے ایک ایسی زبان اور

رسم الخط اختیار کریں۔ جو صرف دو صوبوں تک محدود ہے۔ آپ نے ہندی زبان اور

ہندی رسم الخط کے ہوتے ہوئے اس زبان کو اظہار خیال کے لئے کیوں پسند فرمایا۔

جس زبان کے نقائص گنوانے کی آپ کو ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ گستاخی معاف

اس وقت کہیں یہ بات تو نہ تھی کہ ؎

سونا کہے سنار سے اُتم میری ذات

کالے مُنہ کی گھونگچی تلے میرے ساتھ

آپ دل سے جان سے ایمان سے ہندی کا پرچار کریں۔ کون روکنے والا ہے آپ کو لیکن اتنا تو آپ بھی مانینگے۔ کہ جس وقت آپنے افسانہ نگاری شروع کی۔ اس وقت ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ جس میں زیادہ تر تعداد آپ کے ہم مذہب لوگوں کی تھی۔ اردو ہندی کے قضیے میں پڑا ہی نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی ہندی اس وقت کسی پیر کہن سال پنڈت کی کٹیا میں پڑی رام کا نام جپ رہی تھی۔ اور اردو چونکہ اس وقت ہندوستان کے طول و بلد میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ آپ نے اسی زبان کو اختیار کیا۔ جس کا چرچا تھا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ محض جاہ طلبی اور شہرت کی خاطر ہندی کو نظر انداز کر دیا گیا اور اس زبان کو نوازا جس میں آج آپ کو نقص نظر آرہے ہیں۔ اور یہ کچھ آپ ہی پر موقوف نہیں۔ ملک میں سینکڑوں اہلِ قلم ہندو حضرات موجود ہیں۔ جو اب تک باوجود آویزش کے اردو زبان میں ہی اظہار خیال فرما رہے ہیں:-

منشی جی کا یہ فرمانا کہ:-

"مغل بادشاہوں کے دربار میں ہندی شعراء رہتے تھے۔ اور بعض اوقات بادشاہوں کو ہندی شاعری میں طبع آزمائی کا شوق ہوتا تھا"

بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے یہ تو کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ مغلوں نے بھی جن کو رعیت کی تالیف قلوب کا ہر وقت خیال رہتا تھا کسی دور میں ہندی کو اردو پر ترجیح

دی ہو۔ اور پھر اردو بھی وہ جس کی حالت اس وقت ایک معجون مرکب سے ملتی جلتی ہو۔ حالانکہ اس زمانے میں ہندی جیسے کہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ ایک مکمل زبان تھی۔ اور اس زبان کے اس وقت آج کی نسبت بہت زیادہ جاننے والے اور لکھنے والے بھی موجود تھے

مغلوں کی سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں پر جو تباہی آئی۔ آجتک اس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ لیکن اگر محفوظ ہی۔ تو ایک اُردو زبان اور دوسرے اُردو رسم الخط اور اس زمانے کی ملک کی تعلیمی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے۔ کیا کوئی شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے۔ کہ اردو زبان کی خدمت کرنیوالوں میں ہندو اہل قلم کسی سے پیچھے رہے۔ تعجب ہے کہ ہندی کے عالموں اور استاذہ کو اس وقت ہندی اور سنسکرت کی ترویج کا خیال کیوں نہ آیا۔ انگریزوں کی آمد کے وقت تو ملک میں ہر نقطہ نظر سے برادران وطن کا طوطی

بول رہا تھا۔ پھر ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کی ترویج کی کیوں کوشش نہ کی گئی بد نصیب مسلمان تو مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔ پھر آپ کے بزرگوں کو کس

چیز نے ہندی کے پرچار سے روکے رکھا۔

ایک جگہ منشی جی لکھتے ہیں:۔

اگر ہندوستان کو ایک قوم ہونا ہے۔ اور اس کی قومی حیثیت کو بقا و دوام ملنا ہے۔ تو اس کی قومی زبان اور ایک قومی رسم الخط۔

ہونا چاہیئے۔

یہ ایک اصولی غلطی ہے۔ کہ ہندوستان ایک قوم ہو جائے۔ مسلمانوں کو تو ایک طرف رہنے دیجئے۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے۔ ذرا اچھوتوں کی حالتِ زار پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ بس اس سے زیادہ میں اس کے متعلق اور کچھ عرض نہ کرونگا۔ رہا کسی قوم کی بقاء و دوام کے لیئے اس قوم کی ایک زبان اور ایک رسم الخط کا ہونا تو یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور اسی بقاء و دوام کی خاطر مسلمان عزیب آپ کی ہندی اور ہندی رسم الخط سے پرہیز کر رہا ہے۔ اور بُرا نہ مانیئے۔ یہ اردو زبان اور رسم الخط ہے جسکی بدولت آپ نے افسانہ نگاری میں ناموری و شہرت حاصل کی۔ اور پھر آپ پر ہی موقوف نہیں۔ آپ کے سینکڑوں ہم مذہب اہل قلم اسی زبان اور اسی رسم الخط کی بدولت نام اور شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اور کر رہے ہیں۔ اور انشاءاللہ کرتے چلے جائینگے۔

اب رہی آپ کی قومی زبان۔ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آپ کس قومی زبان کا رونا رو رہے ہیں۔ اگر آپ کی مراد اس قومی زبان سے ہے۔ جس میں بقول مدیر "ندیم" ہنری ٹیت پنڈت سندرلال نے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کے پانچویں اجلاس کے موقع پر اپنا صدارتی خطبہ دیا ہے۔ تو یہ میں آپ کے فیصلہ پر چھوڑتا ہوں۔ کہ اردو کے ادیب اور اردو زبان جاننے والے تو رہے ایک طرف

کیا آپ کے قومی مدارس کے طلبا بھی اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں؟ ذرا اس قومی زبان کی چند سطریں سن لیجئے۔ پنڈت جی فرماتے ہیں۔

"لی پی کا پرشن بھاشا سے ایک بھن پرشن ہے۔ ٹھیک ٹھیک لکھنے اور ٹھیک پڑھنے کیلئے دیوناگری لی پی زیادہ اپیوگی ہے۔ انیک و پرانتوں کے لوگ بھی اسے زیادہ آسانی سے اپنی پرانتے لیپی کا استھان بھی دے سکتے ہیں"

اس زبان کے حسن کا نمونہ آپ نے مذکورہ بالا سطروں میں ملاحظہ فرمایا۔ قومی زبان ہونے کے بارے میں پنڈت جی جو کچھ فرماتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

جو بھاشا میں آپ کے سامنے بول رہا ہوں۔ وہ ابھی راشٹر بھاشا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس کی ایک ادھوری اور ناکام کوشش ہے۔ ہماری قومی زبان ابھی دھیرے دھیرے نرمان ہو رہی ہے"

کیا میں منشی پریم چند صاحب سے پوچھ سکتا ہوں۔ کہ اسی زبان کو آپ "ہندوستانی زبان" یا ہندوستان کی قومی زبان کہہ رہے ہیں۔ آپ کی یہی باتیں یہی غلط انداز۔ یہی پراپوگنڈا مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ آپ کی یہ چالیں مسلمان سخت نفرت سے دیکھتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ منشی جی لکھتے ہیں:۔

جو طبقہ خواہ مخواہ مفرّس اور معرّب زبان لکھنے کی قسم کھائے ہوئے ہے
اس سے تو ہمیں بحث نہیں"

اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ صرف آپ ہی کو نہیں بلکہ اردو کے سچے خادموں میں سے کسی کو بھی ان لوگوں سے کچھ سروکار نہیں گو اس میں تو کچھ کلام نہیں۔ کہ عربی زبان ہندی سے بہت زیادہ مالدار واقع ہوئی ہے۔

اسی طرح ہندی کی نسبت فارسی زبان بھی بہت زیادہ پر لطف اور شیریں ہے اور زمانہ جس رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔ اور غیر زبانوں کی ان تالیفات کو جو اس دور میں غیر ملکوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ ہندوستانیوں تک پہنچانے کے لئے ان کے تراجم کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ تو کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں۔ کہ عربی اور فارسی کے سوا ہندوستان میں اور بھی کوئی اتنی وسیع زبان موجود ہے۔ جو ترجمہ کا حق کر سکے۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے۔ کہ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ دوسری زبان کے الفاظ کی نسبت زیادہ کرخت اور ثقیل ہیں۔ تو کیا بحیثیت اردو کا ایک ادیب کہلانے کے آپ کا ضمیر اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ کہ آپ اردو ایسی لطیف زبان میں ایسے الفاظ کی بھرمار کریں۔ جو اس غریب کا حلیہ ہی بگاڑ دے۔ ہاں اگر کوئی ہندی کا موزوں لفظ موجود ہو اور اس کی اردو میں آسانی سے کھپت ہو سکے۔ تو

اُسے ضرور استعمال کرنا چاہیئے۔

میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں۔ کہ جو لوگ محض علمیت کے بل پر اردو ایسی لطیف زبان میں بلا ضرورت "مفرس اور معرب" الفاظ ٹھونستے ہیں۔ وہ اردو کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔ بلکہ اس میں اجنبیت کا بیج بو رہے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو اردو ایسی خوشگوار زبان میں ہندی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ کی بھرمار کرنے کے آرزو مند ہیں۔ وہ نہ صرف زبان بلکہ اپنی قوم اور وطن کے ساتھ بھی دشمنی کر رہے ہیں۔

ایک اور جگہ منشی جی رقمطراز ہیں:-

> ہر ایک سلیم الطبع شخص یہی چاہتا ہے۔ کہ اس کی تحریر کو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں۔ اور اس کے خیالات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔

اسے کہتے ہیں۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے منشی جی باوجود ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کے احیاء کی کوشش میں مصروف رہنے کے اسی زبان کو اظہار خیال کے لئے پسند فرماتے ہیں۔ جسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ ہندی یا ناگری کو اردو پر ترجیح دے رہے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے اردو کی مخالفت کرنے کے باوجود آپ اپنے افسانے اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

منشی جی فرماتے ہیں:۔

"آنیوالی نسلوں کے سامنے نئے نئے علوم وفنون ہونگے۔ جن پر توجہ کرنی زندگی میں کامیابی کے لئے ضروری ہوگی۔ نئے نئے الفاظ پیدا ہوتے رہیں گے اور زبان کی صورت تبدیل ہوتی رہیگی۔ اور وہ تبدیلی یقیناً سلاست اور ہندوستانیت کی جانب ہوگی۔ جہانتک زبان کا تعلق ہے۔ ہندوستانی زبان کے احیاء سے کسی قوم پسند مسلمان کو اعتراض نہیں ہوسکتا؟"

بالکل ٹھیک ہے۔ کہ ضرورتِ زمانہ کے مطابق نئے نئے الفاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن یہ استدلال سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ نئے نئے الفاظ پیدا ہونے سے زبان کی صورت کیسے تبدیل ہو جائیگی۔ "صورت" بدلنے کی تو ایک ہی صورت ہوسکتی ہے یعنی موجودہ اردو زبان میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ خواہ مخواہ ٹھونسے جائیں۔ جیسے کہ اکثر ہندو اخبارات میں اردو یا فارسی کے بعض بہت خوشگوار الفاظ کو ترک کر کے انکی جگہ ہندی وغیرہ کے ثقیل الفاظ بھر دئے جاتے ہیں۔ رہا نئے نئے الفاظ کا پیدا ہونا۔ تو ایک دنیا شاہد ہے۔ کہ اس وقت تک تو جب کبھی کسی غیر زبان کے لفظ کو اردو میں منتقل کرنیکی ضرورت پیش آئی تو اس ضرورت کو صرف عربی یا فارسی ہی نے پورا کیا ہے۔ غیر زبانوں کی جس قدر کتابیں اسوقت تک اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ اگر یہ عربی اور فارسی موجود نہ ہوتی۔ تو شاید ان کا ترجمہ ہو ہی نہ سکتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نئے نئے الفاظ ہر روز پیدا ہو رہے ہیں۔ اور ہندی ابھی تک ہاتھ بٹانے سے قاصر ہے۔

صرف عربی اور فارسی ہی اس ضرورت کو پورا کر رہی ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط اپنے محاسن سے خالی نہیں لیکن اس کا فیصلہ آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔ کہ اردو زبان کی چاشنی اور اردو رسم الخط کی زود نویسی سے اس کا کسی نقطۂ نظر سے بھی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ ذرا "رام لگنی" کہیے۔ کہ اگر واقعی آپ ہندی اور ہندی رسم الخط کو ملک کی مشترکہ زبان اور مشترکہ رسم الخط دیکھنے کی آس دل میں لگائے بیٹھے تھے۔ تو پھر آپ نے اردو زبان اور اردو رسم الخط کی ترویج میں دوسروں کا ہاتھ کیوں بٹایا؟

ایک اور جگہ منشی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ:۔

"عام رسم الخط کی قومی کشش موجودہ کو قلت استعمال کے باعث صرف آثارِ قدیمہ کے متلاشیوں کی چیز بنا دے گی۔"

منشی جی کے عام رسم الخط کی "قومی کشش" صرف اس قوم تک زیادہ سے زیادہ محدود رہے گی جس قوم کے رہنما اسے قومی رسم الخط بنانے کے درپے ہو رہے ہیں رہا موجودہ رسم الخط (اردو) کا آثارِ قدیمہ کی چیز بن جانا۔ تو بندہ پرور! اس وقت تک باوجود آپ کی کوششوں کے صرف ہندی رسم الخط اور ہندی زبان ہی آثارِ قدیمہ کی چیز بنی ہوئی ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل پیش کرنا آفتاب کو مشعل دکھانا

ہے:

پھر آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

ایسی صورت میں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فارسی رسم الخط کو ہندوستان کے قومی رسم الخط کا درجہ پانے کا کونسا موقع ہے۔"

اگر تنگ نظری یا تعصب کا پردہ آنکھوں سے اُٹھا کر کوئی دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا۔ کہ آپ کے پراپگنڈے کے باوجود ابھی تک یہی فارسی رسم الخط ہندوستان کا قومی رسم الخط متصور ہو رہا ہے۔ اور اسے ہی اولیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ اس کی دلیل اگر آپ چاہیں تو کسی سرکاری مدرسے میں تشریف لے جائیں آپ کے ہم مذہب طلباء ابھی تک اسی رسم الخط اور اسی زبان کو سمجھنے اور پسند کرتے آپ کو نظر آئیں گے۔ اور ہندی زبان اور ہندی رسم الخط سے ایسے کورے ہونگے جیسے کسی زمانے میں مسلمان انگریزی سے ناآشنا تھے۔

منشی جی کو سید حسن ریاض صاحب مصنف "غم تنہائی" سے شکوہ ہے کہ ہندوؤں کے جلسوں میں شریک ہو کر انہیں کچھ پلے نہیں پڑتا۔ فرماتے ہیں :-

ایک مسلمان ہندوستان میں آٹھ سو سال تک رہنے کے باوجود اپنے

پڑوسیوں کی معاشرت سے اتنا بے اثر ہو۔ کہ اس کے القاب و آداب ہی نہ سمجھ گے"

میرے خیال میں تو شکوہ منشی جی کو سب مسلمانوں سے ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جس زبان کا نمونہ مَیں مدیر" ندیم" کے قول کے مطابق پیش کر چکا ہوں۔ ذرا انصاف تو کیجئے۔ کہ کیا کوئی ذی شعور اس زبان کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ایک ہندو کو یہ کبھی شکایت نہ ہوگی۔ کہ وہ مسلمانوں کے کسی جلسے میں شامل ہو کر سید صاحب کی طرح کورا واپس آجائے۔

انگریزی رسم الخط اور اردو زبان پر گوہر افشانی فرماتے ہوئے منشی جی لکھتے ہیں:-

"انگریزی رسم الخط اور اردو زبان کی اس عمومیت کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ ہندوستان کی قومی زبان یا قومی رسم الخط ہے"۔

انگریزوں نے تو کبھی اس بات کی کوشش ہی نہیں کی۔ کہ ہندو اور مسلمان اردو ہندی چھوڑ کر انگریزی زبان اور انگریزی رسم الخط کو اختیار کر لیں اور نہ ہی کسی مہذب ملک میں کبھی ایسا ہوا ہے۔ جب تک اس ملک کے باشندے ایک قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور ایک مذہب کے پیرو ہوں لیکن لطف تو یہ ہے۔ کہ منشی جی کو اردو زبان کی عمومیت کا اعتراف تو ہے۔ لیکن اس کو ملک کی مشترکہ زبان ماننے کے لئے آپ

تیار نہیں۔ اور اس "ہم" سے اگر ہندو قوم مراد ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ یہ نظریہ صرف اہل ہنود تک محدود ہے مسلمانوں کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ یہ تو محض برادرانِ وطن کی تنگ نظری ہے۔ کہ وہ بلا ضرورت ہندی اُردو کا جھگڑا لے بیٹھے ہیں پیسیوں سیاسی اختلاف کے ہوتے ہوئے یہی ایک چیز باقی رہ گئی تھی۔ سو شکر ہے کہ اب ہمارے دوستوں کا یہ ارمان بھی نکل گیا۔ اور یہ قضیہ جو ناگوار صورت اختیار کرتا نظر آ رہا ہے۔ وہ کسی سے چھپی ہوئی چیز نہیں۔

بہرکیف وہ پودا جس نے بادشاہ ہندوستان شاہجہان کے عہد میں نشو و نما حاصل کیا اب اس قدر مضبوط ہو چکا ہے۔ کہ باد مخالف کے جھونکے اُسے اکھیڑ نہیں سکتے آج جو لوگ اُردو کی بیخ کنی پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ وہ صرف ملک سے ہی غداری نہیں کر رہے۔ بلکہ اپنی معاشرت پر کلہاڑی چلا رہے ہیں۔

منشی پریم چند صاحب فرماتے ہیں کہ

"ناگری حروف دُنیا کے سارے ابجدوں میں سب سے زیادہ سائنٹیفک تسلیم کئے گئے ہیں۔"

آج اس دعوے سے اتنا تو معلوم ہو گیا۔ کہ خیر سے یورپ اور ایشیا میں مختلف

زبانوں کے جس قدر ماہر موجود ہیں۔ وہ ناگری حروف سے بھی کماحقہٗ واقف ہیں لیکن کاش منشی جی کوئی ایسی زبان بھی گنوا دیتے۔ جو کسی ملک کے ادبی مقاصد کو پوری کر رہی ہو۔ اور پھر بھی اس پر سائنٹیفک ہونے کا اطلاق نہ ہوسکے۔

میں منشی جی کی صاف گوئی کا بھی معترف ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ مجھے اُردو سے کوئی بغض نہیں۔ میں اِسکی خوبیوں کا قائل ہوں۔ اِس کی برجستگی اور بے ساختگی اس کی فصاحت۔ اس کی ادائے مطالب کی صلاحیت اس کی چستی اور نزاکت صدہا ایسے اوصاف ہیں جو نظر انداز نہیں کئے جاسکتے اور فارسی خط کی زود نویسی اور مختصر نویسی دنیا کے رسم الخطوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔"

یہ تو شاید اس لِئے کہا گیا۔ کہ منشی صاحب نے شہرت اور نام اِسی زبان اور اسی رسم الخط کی بدولت حاصل کیا۔ لیکن آگے چل کر اس مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ:۔

"لیکن اس رسم الخط کی پرورش ہندوستان کی آب وہوا میں نہیں ہوئی ہے اصلی جرم اور تقصیر بھی تو یہی ہے۔ اور اسی جرم کی وجہ سے منشی پریم چند صاحب ایسا اردو کا ادیب بھی اس کی تخریب کے درپے ہو رہا ہے اور اس پر غیر متعصب کہلانے

کا ارمان بھی ہے۔ یہ الفاظ منشی صاحب کے دل کے آئینہ دار ہیں۔ اور اس پر کسی تنقید کی ضرورت نہیں۔

ایک مقام پر فارسی رسم الخط کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"اگر فارسی رسم الخط اپنی خوبیوں کے ساتھ ادائے اصوات کی قابلیت رکھتا تو فطرت اس کے ساتھ ہوتی۔ اور کوئی انسانی کوشش اسے ہندوستان کے قومی رسم الخط ہونے سے روک نہ سکتی۔"

فارسی رسم الخط پر تو یہ الزام تھوپ دیا گیا۔ لیکن کیا منشی جی نے ہندی کے متعلق اپنا اطمینان فرما لیا ہے۔ کہ کہیں اس میں بھی یہ نقص تو نہیں اور اگر ہے اور ضرور ہے تو پھر کیا اچھا ہو کہ بجائے اس کے کہ آپ ایک مردہ شاخ کو ہرا کرنے کی کوشش کریں۔ ہری ٹہنی کو مرنے سے بچانے کی فکر کیوں نہ کی جائے۔ اور ہندو اور مسلمان باہم مل کر اردو کو اور زیادہ سلیس اور آسان بنانے کی کیوں کوشش نہ کریں تاکہ یہ زبان اور یہ رسم الخط جو اس قدر فروغ پا چکا ہے۔ اس جھگڑے سے پاک ہو جائے۔ میں نے محض منشی صاحب کے مضمون کا جواب اسی رنگ میں دینے کی

کوشش کی ہے۔ جس جذبے کے ماتحت منشی جی نے ایک "گذارش" لکھی ہے:

میں اپنے مسلمان دوستوں سے اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ برادرانِ وطن جس طرح ہندی کے احیاء کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں لیکن ہمارے یہاں سوائے اس کے کہ اردو صرف دہلی اور لکھنؤ کی ہی زبان ہے اور پنجاب والے محض غلط اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور کچھ نہیں۔ اب ان باتوں کا وقت نہیں رہا۔ ایسے مضامین تضیع اوقات کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے اب ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ آپ لوگ بھی ہوشیار ہو جائیں اور پراپوگنڈے کا جواب پراپیگنڈے سے دیں۔ ہندی کی حمایت تو صرف ہندو ہی کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اسے سیاسی اور مذہبی رنگ دے رہے ہیں لیکن شکر ہے۔ کہ آپ کا ساتھ دینے والے بھی بہت سے موجود ہیں لیکن خوف تو یہ ہے۔ کہ ع

یہ غفلتیں مبادا کوئی روزِ بد دکھائیں!!

اردو رسم الخط

اردو رسم الخط

کچھ عرصہ سے اردو ہندی کا قضیہ ایسا مسئلہ بن گیا ہے۔ جو ایک طرف تو ایک قوم کی اصلی ذہنیت کو عریاں کر رہا ہے۔ اور دوسری جانب بہی خواہان اردو کے یاس انگیز جمود کا آئینہ دار ہے۔

مجھے اس اہم موضوع پر دوبار کچھ اظہار خیال کا موقع ملا ہے۔ میں ۔۔۔ مدت سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ برادرانِ وطن نہایت خاموشی کے ساتھ اردو کی بیخ کنی کے درپے ہو رہے ہیں اور ایسے ایسے اعتراضات اس زبان کے متعلق محض پراپیگنڈا کے طور پر پیش کرنے لگے ہیں۔ جن کے متعلق انہیں یقین ہے کہ مسلمانوں سے بھی کوئی نہ کوئی ہمنوا ان کو مل جائیگا۔

اردو پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ اسمیں عربی، فارسی الفاظ کثرت سے ہیں اور ہندوان الفاظ کی ثقالت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

میرا خیال تھا کہ جہاں تک عربی فارسی الفاظ کا تعلق ہے مسلمانوں میں سے

کوئی شخص بھی ہندوؤں سے متفق نہ ہوگا۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کئی ایک محب وطن و محب قوم مسلمان آستینیں چڑھا کر عربی فارسی الفاظ کی بیخ کنی کے لئے اکھاڑے میں اتر رہے ہیں۔

انسان کی زندگی عبارت ہے، جذبات سے اور جب جذبات کو ٹھیس لگے تو پھر ہر قسم کے تعلقات چھکے پھٹے دھرے رہ جاتے ہیں۔ رسالہ "زمانہ" کی کسی اشاعت میں عربی فارسی الفاظ کے خلاف ایک مجتہدانہ مضمون اپنے ایک محترم دوست کے نام سے دیکھ کر مجھے تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ میرے محترم دوست نے عربی فارسی الفاظ کے متعلق کچھ ایسا زہر اگلا تھا۔ کہ طبیعت سخت بیزار ہوئی اور مجھے مجبوراً لب فریاد وا کرنا پڑا! اور "اردو ہندی کا قضیہ" کے عنوان سے میں نے ایک مضمون "نیرنگ خیال" لاہور میں شائع کرایا۔

اس کے کچھ روز بعد رسالہ "شاہکار" لاہور میں منشی پریم چند صاحب کا ایک مضمون "ایک گذارش" جب میری نظر سے گذرا، تو اصل حقیقت آشکار ہوگئی اور صاف نظر آنے لگا، کہ ہمارے ہندو دوست زبان کے پردے میں مروجہ "رسم خط" مٹانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ رسالہ "ادب لطیف" (لاہور) میں میں نے "نوائے تلخ" کے عنوان

سے منشی پریم چند کی "ایک گذارش" کا جواب عرض کیا۔ اور ان دونوں مضامین کی پاداش میں مجھ پر "متعصب" کا الزام عاید ہوا۔

اگر اردو زبان اور رسم الخط کی خدمت کرنا اور اسکے مخالفین اور نادان دوستوں کے خلاف آواز اٹھانا .... تعصب ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ آج پھر راقم الحروف اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

تو خیر! اس میں تو اب شک کی مطلق گنجائش نہیں۔ کہ ہندو حقیقت میں اردو رسم خط کی بیخ کنی کے درپے ہے لیکن اکثر آزاد خیال ہندو اہل قلم کو اس قسم کی نفرت انگیز تحریکوں سے الگ تھلگ دیکھ کر ہم نے جانا کہ لیجیے، جب ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

تو اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ دیکھکر کہ خال خال مسلمان بھی "درون پردہ یا بیرون پردہ" عربی فارسی الفاظ کے خلاف اپنی اپنی ڈفلی بجانے لگے ہیں تو معلوم ہوا کہ حقیقت میں صنم خانوں کو کعبے سے پاسبان مل رہے ہیں۔

خوش قسمتی سے اس کے سب اراکین ایسے بزرگ ہیں۔ جن کے دل میں قوم کا درد اور "زبان" سے محبت موجود ہے اس انجمن میں سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ پروفیسر بھی ہیں، مدیر صاحبان بھی ہیں۔ شاعر لوگ بھی ہیں، ادیب بھی ہیں اور پھر انجمن کے سیکرٹری میاں بشیر احمد صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا ایک علم دوست بزرگ ہیں امید ہے کہ یہ انجمن اپنے اغراض و مقاصد میں ضرور کامیاب ہوگی۔ اور زندہ دلان پنجاب اس اہم کام میں انجمن کا ہاتھ بٹائیں گے۔

لیکن انجمن کے سیکرٹری میاں بشیر احمد صاحب نے اصلاح زبان یا ترقی زبان کے متعلق جو مفید تجویزیں بتلائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

عربی اور فارسی کی غیر ضروری ترکیبیں ترک کر دینی

چاہیئیں اور اگر ادائے مفہوم کے لئے فقرہ

ذرا لمبا ہو جائے تو کیا حرج ہے'

مجھے اس سے سخت اختلاف ہے اگر اسے ابتدائے عشق مان لیا جائے تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا؟ سبحان اللہ ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

معلوم ہوتا ہے یہ آگ بہت مدت سے سلگ رہی تھی اور اس وقت بھی کچھ ایسے مسلمان موجود تھے۔ جو اردو زبان میں سے عربی فارسی الفاظ کے اخراج کے مؤید تھے اور شاید انہی لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں جناب مولوی کرامت حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا، مرحوم جج ہائیکورٹ الہ آباد . . . . . نے یہ فرمایا تھا، کہ اردو کی زیب وزینت عربی اور زیادہ تر فارسی الفاظ سے ہے۔ یعنی بقول حضرت اکبر۔ ع

رخصت ہوئی فارسی تو اردو بھی گئی

آج آپ عربی اور فارسی کی "غیر ضروری" ترکیبیں ترک کیجئے۔ کل عربی فارسی الفاظ سے بیزاری کا اظہار فرمائیے: اگلے روز کھلے بندوں کہدیجئے کہ "اردو رسم الخط" حقیقت میں "عربی رسم الخط" ہے۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو عربی سے کیا کام؟ کچھ نہ کچھ ترمیم ضرور ہونی چاہیئے۔ گھر بیٹھے اردو ہندی کا قضیہ مٹ جائیگا۔ نہ انجمن ترقی اردو کی ضرورت ہوگی۔ نہ کسی کو مفت میں خامہ فرسائی کرنی پڑیگی۔ لیکن اسکے ساتھ ذرا اتنا اور سوچ لیجئے کہ۔ ع

خشت اول چوں نہد معمار کج!

تو اسکا نتیجہ کیا ہوگا۔

اگر حامیان اردو کے یہی لچھن چندے اور رہے، تو وہ دن دور نہیں۔ جب

ہندی والوں کے ہاں گھی کے چراغ جلیں گے۔

"پچھلے دنوں پروفیسر گلشن رائے نے جو غالباً اپنے آپ کو عقل کل سمجھے بیٹھے ہیں اردو شاعری پر بھی "سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور" میں ایک چھوڑ دو مضمون شائع کروا کر اپنی علمیت یا ناواقفیت کا اچھا خاصہ پرچار کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا۔ کہ لاہور والوں کی انجمن ترقی اردو پنجاب کیطرف سے ان مضامین کا جواب ضرور دیا جائے گا لیکن افسوس یہ امید بھی بر نہ آئی۔ انشاء اللہ کسی فرصت میں پروفیسر گلشن رائے کے مقالوں کا جواب عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن پروفیسر جی سے میں اس قدر اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اردو کے خلاف جو زہر آپ نے اگلا ہے تو اب آپ کی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ فی الحال اتنا تو کریں کہ اپنا نام بدل ڈالیں "رائے" تو واقعی ہندی ہے لیکن "گلشن عزیب فارسی ہے یہ ہندی فارسی کا سنگھٹن مہاتما کے زمانے میں ہی زیب دیتا تھا۔ کیا تماشا ہے کہ وہ قوم جس کے افراد کے نام میں بھی فارسی الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ آج اس زبان سے بیزاری کا اظہار کر رہی ہے۔

وہ مسلمان دوست جنہیں ہندی اُردو کا قضیہ پیدا ہوتے ہی عربی اور فارسی

الفاظ ناموزوں نظر آنے لگے ہیں بشکر ہے کہ انکی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ لیکن اسکے ساتھ یہ بھی خوشی کا مقام ہے کہ سینکڑوں علم دوست ہندو بھائی ایسے بھی موجود ہیں۔ جو باوجود اپنی قوم کی ان غیر مآل اندیشانہ تحریکوں کے مسلمانوں کے دوش بدوش اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور اپنے ہم مذہب بھائیوں کی ان طفلانہ حرکات سے عمداً نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔

میں اپنے پہلے دونوں مقالوں میں یہ واضح طور پر عرض کر چکا ہوں۔ کہ اردو کیخلاف جو تحریک آج پیدا ہوئی ہے۔ وہ محض ایک سیاسی تحریک ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کو گاندھی یا پنڈت جواہر لال نہرو یا بابو راجندر پرشاد کی مخالفانہ کوششوں اور غیر مآل اندیشانہ روش سے آزردہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی ہے۔ کہ گاندھی اب اصلی روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ایک مدت سے جو اس نے اتفاق اور رواداری کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ آج اسکا پول کھل رہا ہے۔ گاندھی کا یہ کہنا کہ

"اردو زبان مسلمانوں کی زبان ہے، قرآن
کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اور مسلمان بادشاہوں
نے اسے بنایا یا پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے

رکھیں اور پھیلائیں"۔

یہ الفاظ اس ہندوستانی مہاتما کی اصل فطرت اور ذہنیت کے ترجمان ہیں گاندھی کا یہ استدلال محض غلط ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ جس وقت اردو زبان وجود میں آئی۔ کیا اسوقت ہندوستان میں صرف مسلمان ہی آباد تھے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس زمانے میں ہندوؤں کی آبادی آج کی نسبت بہت زیادہ تھی۔ فارسی عربی تو مسلمان لائے لیکن اردو کی تشکیل کے وقت ہندی کو کیوں فروغ حاصل نہ ہوا؟ کیا وجہ تھی کہ ہندی ایک عضو معطّل کی طرح نظرانداز کر دی گئی۔ اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ ملکر ایک ایسی زبان بنالی جو اس زمانے میں لشکری زبان کے نام سے موسوم ہوئی تھی۔ پھر اسے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے اہل قلم نے فروغ دیا اور آج وہ ہندوستان کے کونے کونے میں اسی طرح سمجھی اور بولی جاتی ہے جس طرح یورپ میں فرانسیسی اس لئے اسے ملک کی مشترکہ زبان تسلیم کرنے سے انکار کرنا۔ مذہبی تعصب کے سوا اور کچھ بھی نہیں گاندھی کی بات کانگرسی مسلمانوں کے لئے سند ہو تو ہو۔ عام مسلمانوں کے لئے قابل پذیرائی ہرگز نہیں۔

رہا گاندھی کا یہ کہنا کہ اردو زبان

"قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے"۔

اصل حقیقت کو آشکار کر رہا ہے۔ یہ الفاظ اس شخص کی کور باطنی کی ایک بین دلیل ہے جو پہلے مسلمانوں کو انکے جائز حقوق دینے کا ڈھول بجا رہا تھا۔ اور آج اچھوتوں پر محض اس خیال سے ڈورے ڈال رہا ہے کہ اگر کہیں اچھوتوں نے مذہب تبدیل کر لیا۔ تو پھر بقول مدیر ملاپ "ہندوؤں کا کیا ہوگا"۔

"قرآن کے حروف" سے اصل مطلب رسم الخط ہے، اور یہی رسم الخط ہندو کی آنکھ میں خار بنکر کھٹک رہا ہے، ستم ہے کہ وہ شخص جو لنگوٹی باندھکر ملک کی فلاح اور ترقی کا علمبردار بنا پھرتا ہے۔ ملک کی مشترکہ زبان کو صرف ایک قوم کی مذہبی زبان قرار دیتا ہے۔ اور اسکی تنگ دلی اور تعصب یہاں تک ترقی کر گیا ہے کہ آج "اردو" کا لفظ بھی اسکے لئے ہار ہے اور مسلمانوں کو من حیث القوم یہ طعن دیتا ہے کہ

"مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"۔

لیکن ہندو تو اسکی تخریب کے درپے رہیگا، گاندھی کی اس قسم کی گیدڑ بھبکیاں ہم لوگ ایک مدت سے سن رہے ہیں۔ یہ سب کا عمر کا تقاضا ہے۔ معمر ہو جانے کے باعث انسان ذرا زیادہ "گرم مزاج ہو جاتا ہے۔ اور اسے اپنی زبان پر قابو نہیں رہتا۔ لیکن اس حقیقت سے تو گاندھی کو بھی غالباً انکار نہ ہوگا۔ کہ

مسلمان اردو رکھیں گے اور ضرور رکھیں گے۔ پھیلائیں گے۔ اور ضرور پھیلائیں گے۔
اور آپ دیکھیں گے کہ کئی ہندو دوست بھی اس کام میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹائیں گے

ایک قوم کی تنگ دلی اور کوتاہ بینی اور تعصب کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ صدیوں کی مروج زبان کا نام بھی آج بدلا جا رہا ہے - اور انڈین نیشنل کانگرس کے کسی اجلاس میں اردو کی بجائے ہندوستان کی زبان کا نام "ہندوستانی" قرار پاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اردو میں کونسے ایسے کیڑے پڑے ہیں۔ جو آپ اسکا نام بدل رہے ہیں۔ یا ان چار حروف میں کونسا زہر ہے جن کے زبان پر آتے ہی آپ کا گلا گھٹنے لگتا ہے۔ ہاں تعصب کی کہہ نہیں سکتے: ممکن ہے کہ "اردو" کا لفظ زبان پہ آنے سے مذہب بھرشٹ ہوتا ہو۔ آپ نے نام بدلنا تھا بدل دیا۔ کانگرس کی ڈفلی بجانے والے مسلمان دوستوں نے اسے قبول بھی کر لیا۔ اور وہ بھی محض نیک نیتی سے کہ چلئے اگر نام تبدیل کرنے سے ہی ایک ناگوار قضیہ کا تصفیہ ہوتا ہے، تو منظور ہے۔

لیکن بُرا ہو اس تنگ دلی اور تعصب کا جو کسی کو اپنا تھوکا ہوا چاٹنے پر مجبور کرے۔ "اردو" کو ہندوستانی کہنا بھی محض گاندھی کی تحریک تھی۔ یہ ریزولیوشن گاندھی

نے ہی بنایا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ شخص اس پر بھی قائم نہ رہا۔" بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کے کسی جلاس میں جب پھر زبان کا سوال پیدا ہوا۔ تو گاندھی نے بقول جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن، ہندوستانی کے ساتھ ہندی کا لفظ بھی جڑ دیا۔ یعنی "ہندی ہندوستانی" جو سرے سے ایک بے معنی لفظ ہے۔ ہاں! قدیم ہندوؤں کی زبان کا جو تعلیم اور تہذیب کے نام سے بالکل کورے تھے کوئی لفظ ہو تو ہو۔ کیا اچھا ہوتا جو اسے "بوم بھاشنہ" کہا جاتا۔

مولوی صاحب قبلہ فرماتے ہیں کہ جب گاندھی کے اس "ہندی ہندوستانی" لفظ کی لغویت پر بحث ہو رہی تھی۔ تو اس وقت کانگرس کے دو صدر یعنی پنڈت جواہر لال نہرو اور بابو راجندر پرشاد بھی موجود تھے۔ لیکن یہ دونوں ٹس سے مس نہ ہوئے۔

اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ ان لوگوں کو نہ مسلمانوں سے محبت، نہ مسلمانوں کے جذبات کی پرواہ نہ ہمسائیگی کا لحاظ، پھر زبان ایسے مسئلہ پر ٹس سے مس کیوں ہوتے؟ آپ زبان کا رونا رو رہے ہیں اور انہیں کے ایک بھائی ڈاکٹر مونجے بھارت ورش پر زرد رنگ کا جھنڈا لہراتا دیکھنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ہندو کو ہر طرح یہ حق حاصل ہے کہ وہ اردو کی بجائے ہندی کا پرچار کرے۔ اور

اپنے لئے ہندی یا سنسکرت کو ذریعہ تعلیم قرار دے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی پراچین تہذیب کو تازہ کرنا چاہے تو مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ چشم ماروشن و دلِ ماشاد! وہ اپنے لئے ہندوستانی پسند کرے یا "ہندی ہندوستانی" لیکن ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی زبان وہی رہیگی۔ جو بقول گاندھی

"مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے"۔

اور رسم الخط بھی وہی رہیگا جس کے متعلق منشی پریم چند صاحب اپنی "ایک گذارش" مطبوعہ رسالہ شاہکار لاہور دسمبر ۱۹۳۵ء میں فرماتے ہیں۔

"لیکن اس رسم الخط کی پرورش ہندوستان کی آب وہوا میں نہیں ہوئی"۔

" بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کی کاروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ منشی پریم چند صاحب اُن سے متفق تھے۔ اور گاندھی کی تنگ نظری سے انہوں نے بیزاری کا اظہار بھی فرمایا۔ غالباً مولوی صاحب قبلہ کی نظر سے منشی جی کی "ایک گذارش" جسکا حوالہ میں اوپر دے چکا ہوں نہیں گذری۔ اس میں منشی جی نے اردو رسم الخط کے متعلق کھلے کھلے الفاظ میں کہدیا ہے کہ ہندو اس زبان اور اس رسم الخط کو ہرگز قبول نہیں کرسکتا۔ گو اردو زبان اور اردو رسم الخط سے بیزاری

کا اظہار کرتے ہوئے منشی جی نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان کے کئی صوبوں میں ہندی کی تحریک فی الحال کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ لیکن اسکے ساتھ انہیں یہ بھی امید ہے کہ پچاس سال کے عرصہ میں یہ تحریک کامیاب ہو جائیگی"۔ بشرطیکہ دوسرے بالکل سوئے پڑے رہیں۔

منشی صاحب کی نیک نیتی پر شک کرنیکی بہت کم گنجائش ہے۔ کیونکہ وہ بڑی شد ومد کے ساتھ یہ اعلان فرما چکے ہیں

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فارسی رسم الخط کو ہندوستان
کے قومی رسم الخط کا درجہ پانے کا کونسا موقع ہے"۔

قلم سے تو منشی پریم چند صاحب ہندی کا پرچار کرتے ہیں۔ لیکن "زبانی جمع خرچ سے" مسلمان دوستوں کو بھی خوش کئے جاتے ہیں۔ اتنی رواداری بھی غنیمت ہے۔ ع

سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

"بھارتیہ ساہتیہ پریشد، یعنی ہندوستان بھر کی" ادبیات کی انجمن کی کارروائی پر جو مقالہ مولوی عبدالحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں آپ نے اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا ہے کہ اردو ہندی کے موجودہ قضیہ کی تمام تر ذمہ داری صرف

گاندھی پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ کیونکہ شکنی اور شانتی کا بھی علمبردار ہندو مسلم منافرت کا بھی ذمہ دار ہے۔ لیکن کیا میں ان مسلمانوں سے جو نیشنل کانگرس کے اس اجلاس میں جسمیں گاندھی کی تحریک پر "اردو" کا نام بدلکر ہندوستانی رکھا گیا موجود تھے۔ پوچھ سکتا ہوں کہ انہوں نے قوم سے پوچھے بغیر کیوں زبان کے نام کی توہین آمیز تبدیلی منظور کرلی۔ اگر آج دس کروڑ مسلمانوں کے سامنے بھی مسئلہ پیش کیا جائے تو مشکل سے دس فیصدی آپ کے ہمخیال نکلیں گے۔ اور پھر کسی حکیم نے تو بتایا نہیں کہ گاندھی جو کچھ کہے، اسے بلا چون وچرا تسلیم کرلیا کرو۔

بحثیت اردو کا ایک خادم ہونے کے میں مسلمانوں سے یہ درخواست کرونگا کہ وہ نیشنل کانگرس کے فیصلہ کو ہرگز قبول نہ کریں۔ گاندھی اور اسکے رفقائے کار پہلے بنگالیوں مرہٹوں گجراتیوں اور سندھیوں کو تو اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ اپنی زبان کی بجائے ہندوؤں کی ناگری لپی (واہ سبحان اللہ رسم خط کے لئے کیا لطیف الفاظ ہیں) قبول کرلیں۔ پھر مسلمانوں کے بھی منہ آئیں لیکن مسلمانوں کے منہ آنے سے پیشتر اپنے آزاد خیال ہندو دوستوں سے بھی پوچھ لیں۔ کہ آیا وہ اس "ہندی ہندوستانی" اور آپ کی ناگری لپی کو پسند بھی کرتے ہیں یا نہیں؟

مسلمانوں کو گاندھی کی صاف گوئی کی داد دینی چاہیئے۔ کہ اُس نے آخر صاف صاف تو یہ کہدیا۔ کہ ملک کی زبان ’ہندی ہندوستانی‘ ہو گی۔ اسی طرح گاندھی اور اسکے ہم خیال لوگوں کو یہ بھی سن لینا چاہیئے۔ کہ مسلمان اس قسم کی لغو تحریکوں کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ آپ کا اصل مقصد صاف ظاہر ہے۔ جس طرح اس وقت پیپل کٹنے پر سر کٹتے ہیں۔ گائے ذبح ہونے پر انسان ذبح کئے جاتے ہیں۔ باجے گاجے پر دنگا فساد ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ اب یہ بھی چاہتے ہیں کہ اردو ہندی کے قضیہ پر بھی سر پھٹول شروع ہو جائے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ وہی ہندو جو آج سے کچھ عرصہ پیشتر مسلمانوں سے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ آج اپنے راہنماؤں کی غلط روش کی بدولت مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں

سر سید علیہ الرحمتہ نے کسی موقع پر فرمایا تھا۔

”وہ قوم جس کے سلف کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل تھی، لیکن اس نے اسے بھلا دیا۔ وہ قوم ذلیل اور رسوا ہوئی۔ لیکن وہ قوم جس کے سلف کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل نہ تھی۔ لیکن اس نے یاد رکھی

عروج پر پہنچی"۔

ان الفاظ پر غور کیجئے۔ اور ساتھ ہی اپنی غفلتوں پر نگاہ ڈالئے حقیقت خودبخود آشکار ہو جائے گی۔ ہندوؤں سے کسی قسم کا شکوہ کرنا اپنی کمزوری اور پستی کا اقرار کرنا ہے۔ ہندو اگر آج ہندی کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ تو آپ کو کون منع کرتا ہے۔ کہ آپ اردو کو فروغ دینے کی کوشش نہ کریں۔ ہاں! ایک بات ضرور ہے۔ ہندو عمل کرتا ہے۔ آپ صرف باتیں کرنی جانتے ہیں۔ ہندو نے اپنی سبھائیں انجمنیں قائم کرلی ہیں۔ آپ ابھی اس مسئلہ پر غور ہی کر رہے ہیں۔ ہندو اُردو کی بیخکنی کے درپے ہیں۔ آپ کے ہاں اس کے جواب میں صرف یہ تحریک ہو رہی ہے۔ کہ اُردو میں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ نکال دو۔ اور عربی فارسی ترکیبیں خارج کر دو اسے کہتے ہیں ع بازیٔ طفلانۂ دل"۔

ہندو قوم کے پاس سرمایہ ہے۔ وہ اپنے ہر کام میں آسانی سے کامیاب ہو جاتی ہے۔ اُردو زبان کو فی الحال ہندی کی انجمنوں اور ہندی رسائل سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جس قدر کہ "فلم" کے ذریعہ اس پر کاری ضرب لگائی جا رہی ہے آج کل "منشی لوگ" جو چند ٹکے لیکر ڈرامے تیار کر دیتے ہیں۔ اپنے آقاؤں کے ایما سے

ہندی کے الفاظ کثرت سے ٹھونس دیتے ہیں۔ آج مسلمان ان الفاظ سے آشنا ہو رہے ہیں۔ کل یہی ہندی کے الفاظ ان کی زبان پر ہونگے۔ پھر ہوتے ہوتے عام گفتگو کا رنگ ڈھنگ بھی وہی ہو جائے گا جسکی ہندو آس لگائے بیٹھے ہیں۔

پراپیگنڈا کا جواب پراپیگنڈا ہوا کرتا ہے۔ مسلمانوں کو بھی خدا اگر توفیق دے تو مخالفین کے خلاف وہی ہتھیار استعمال کرنا چاہیئے۔ جو آج وہ ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ فلم انڈسٹری ہندو کا ایک کامیاب پراپیگنڈا ہے۔ اور تجارتی نقطہ نگاہ سے بھی بڑے فائدے کا کام ہے۔ لیکن مسلمان اگر کہیں اس طرف متوجہ بھی ہوئے تو وہ بھی تفریح اور عیش کے لئے۔

اُردو کے فروغ دینے کے لئے ایک تجویز یہ بھی ہے۔ کہ ہر شہر میں اس مطلب کے لئے انجمن قائم کی جائیں۔ اور یہ کام ان لوگوں کے سپرد کیا جائے۔ جنہیں واقعی اپنی زبان سے محبت ہو۔ اور مخالفوں کی کوششوں کا احساس ہو، اِس قسم کی انجمنوں کا صرف یہی کام نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ وہ گاہے گاہے مشاعرہ کرلیا کریں بلکہ انہیں نثر کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ مشاعرہ کے دوش بدوش مضامین لکھوانے کا سلسلہ بھی ہونا چاہیئے اور اگر واقعات اجازت دیں۔ تو یہ انجمنیں سالانہ جلسے منعقد

کریں ۔اور اُردو کے ادباء کو مدعو کریں ۔اور ہندو دوست بھی جنہیں اُردو سے
ہمدردی ہو شامل ہوں ۔
ملک میں اُردو کے رسائل بکثرت موجود ہیں ۔ان رسائل کے مدیر صاحبان
کا یہ فرض ہے کہ وہ انجمنیں جن کے پاس نشرو اشاعت کے وسائل نہ ہوں ۔ان کی
مدد کریں ۔ ان کے جلسوں کی کارروائیاں اپنے رسائل میں شائع کریں ۔اور ان
انجمنوں کا پراپیگنڈا کرنے سے گریز نہ کریں ۔
اس قسم کی انجمن کے پاس اگر وسائل ہوں تو ان کو چاہئے ۔کہ اچھی اچھی
کتابیں شائع کریں ۔اور اپنے آس پاس کے قصبوں میں وقتاً فوقتاً اُردو کی
ترقی کے لئے تحریک کرتے رہیں ۔

جہاں جہاں قومی کالج اور مدارس ہیں ۔اساتذہ کا فرض ہے ۔کہ وہ اپنے
یہاں "فروغ اُردو" یا "بزم اُردو" کے نام سے مجلسیں قائم کریں ۔ اور مختلف موضوع پر طلباءً
اپنے اپنے خیال کا اظہار کریں ۔اس تحریک سے لڑکوں میں تقریر کا شوق پیدا ہوگا ۔اور
کسی روزدہ اُردو میں اچھی خاصی تقریر کرنے لگیں گے ۔مدارس کے طلباء میں مضمون نویسی
کا مقابلہ کروایا جائے ۔ اور کامیاب لڑکوں کو انعام دیئے جائیں ۔لڑکوں کو یہ ترغیب

دی جائے۔ کہ وہ سکول میں اور گھر میں اُردو زبان میں گفتگو کریں۔ اگر ہماری نئی پود میں اُردو کا شوق پیدا ہو جائے۔ تو آپ دیکھیں گے۔ کہ یہ جماعت سدِ سکندری کا کام دے گی۔

اگر ہندو دوست ہندی کے پرچار کے لئے جا بجا جلسے کر رہے ہیں۔ تو آپ میدان میں کیوں نہیں نکلتے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے سیکرٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے عرض کروں گا۔ کہ اِس تلخ تجربہ کے بعد جس کا حال اُنہوں نے متعدد رسائل اور اخبارات میں شائع کرایا ہے۔ اپنے رفقاء کے ساتھ ملک کا دورہ کریں اور تحفظ اُردو کے لئے انجمنیں قائم کریں۔ آپ دیکھیں گے۔ کہ ایک قلیل مدت میں انشاء اللہ آپ کو وہ کامیابی ہو گی۔ کہ آپ خود حیران ہوں گے۔

وہ زبان جو انسان کے لطیف ترین جذبات کی ترجمان ہو۔ وہ زبان جس میں ادب کا سرمایہ بکثرت موجود ہو۔ وہ زبان جو ایک ملک کی تعلیم و تہذیب کی آئینہ دار ہو۔ وہ زبان جو ملک کے طول و عرض میں بولی۔ اور سمجھی جاتی ہو۔ اگر ایک قوم اسے تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ تو دوسری قوم کا یہ ملکی قومی اور اخلاقی فرض ہے۔ کہ اِس کے استحکام کے لئے پوری

پوری کوشش کرے۔

مجھے ان لوگوں سے پورا پورا اتفاق ہے۔ جو یہ چاہتے ہیں۔ کہ زبان سلیس اور عام فہم ہو۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ ادباء تو خاصی سلیس زبان لکھتے ہیں لیکن اکثر اخبارات کے مدیر صاحبان بے احتیاطی ضرور برت رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے مقالوں میں ایسے ایسے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں جن کی ایک تو سرے سے ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ دوسرے بیشتر لوگ ان کا مطلب اور معنی نہیں سمجھ سکتے۔

مجھے اپنے دوستوں سے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان ہندو دوستوں کے ہمنوا ہیں جو اُردو کو ملک کی مشترکہ زبان تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ صرف اس قدر عرض کرنا ہے۔ کہ قوم سے اختلاف رائے رکھکر آپ کو شہرت تو ضرور حاصل ہو گی۔ اور ایک قوم آپ کو آزاد خیالی کی سند بھی عطا کر دے گی۔ لیکن بات وہی ہو گی کہ ع

بدنام بھی ہونگے تو کیا نام نہ ہو گا!

لیکن جس کے دل میں مذہب کا احترام نہ ہو۔ اسے وطن سے قوم سے اور قوم اور وطن کی زبان سے کیا محبت ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگ اگر ہمہ دانی کی ہیکل گلے میں ڈال کر زبان کے خلاف بھی کچھ کہدیں۔ تو شکایت نہیں کیونکہ بقول حضرت اقبال؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں۔ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

گم ہو گئے

گم ہوگئے

اب سوال یہ ہے کہ گم ہوا کیا؟

ممکن ہے کہ آپ یہ سمجھیں کہ کسی لالہ جی کی گائے گم ہوگئی ہو اور اس نے سرکار میں عرضی دیدی ہو کہ کسی مُسلے نے میری شردھیئی گائے ماتاجی اغوا کرلی ہے۔ اسلئے پنجاب میں پٹھانوں کا داخلہ بند کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے دیکھ کر۔ کانگرسی لیڈروں کے اوسان گم ہوگئے ہوں اور انہوں نے مہاسبھائیوں سے مل کر یہ سمجھوتا کر لیا ہو کہ فی الحال اپنے اختلافات تو رکھو چھپر پہ پہلے ان مسلمانوں سے نپٹ لو۔ کیونکہ اگر یہ دس کروڑ مسلمان کہیں متحد ہوگئے تو پھر نہ تو مہاتما جی کے برت ہی کچھ کام آئینگے اور نہ پنڈت جی مہاراج کی گیدڑ بھبھکیوں سے ہی کچھ بنے گا۔ اور اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو آپ کو یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے یہ خدائی خاکسار اگر کسی روز آتشبار ہو کر خرمن امن جلانے پر تل بیٹھیں تو پھر ملک کے ہی اوسان گم ہو جائیں تو کچھ بعید از قیاس نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی خردمند اپنے عقل و ہوش محض اسلئے کھو بیٹھے کہ پنجاب میں چونکہ اسوقت مسلم وزارت ہے۔ اس لئے ہندوؤں کا کیا بنے گا۔ تو یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اس قسم کے کانگرسی راج کے خواب دیکھنے والے کو اتنا بتلا دینا عین دانشمندی ہے کہ ہندوستان میں صرف اسوقت تک کانگرس کا راج رہ سکتا ہے۔ جب تک مسٹر جان بل کا دستِ شفقت

قضا و برم کی طرح چوٹی وار سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اور اگر کسی کے حواس محض اس لئے گم ہو جائیں کہ حضرت مولینا آزاد جنکو مسلمانوں کی شومئی قسمت سے ابھی تک مغفوریت کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا محض بات کی للاج کی خاطر کانگریس کا ساتھ دے رہے ہیں تو اسے بھی ہم دانائے راز ہی کہینگے اور اگر مولوی فضل حق صاحب کی گرج سنکر انند بھون کے ساکن کے حواس باختہ ہو جائیں تو کوئی مائی کا جایا انہیں مورد الزام تصوّر نہیں کر سکتا۔ اور گاندھی جی کا بار بار یہ دعوٰے کہ میں روز اوّل سے ہی صلح اور آشتی کا علمبردار بنکر بھارت ماتا پر نازل ہوا ہوں اور ہندو مسلم منافقت سے سوائے اسکے کہ ہندوستانی زندہ قوموں میں شمار ہونے لگیں اور کچھ مقصد نہیں سنکر اگر کسی کی عقل ماسٹر تارا سنگھ کا روپ دھار لے تو یہ بھی کوئی بڑا پاپ نہیں کیونکہ گاندھی جی نے جنہیں بھگوان مہاراج کی کرپا سے برت رکھنے اور حکام سے ملاقات کرنے کی راہ نکالنے میں کمال حاصل ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا ابھی تو محض اسی لئے کھڑا کر رکھا ہے کہ ہندو اور مسلم میں جو تم پیزار چلے کیونکہ زندہ قوموں میں شمار ہونے کی یہی سب سے بڑی علامت ہے اسی طرح اگر یہ سنکر کسی مہاسبھائی کی عقل گم ہو جائے کہ گاندھی جی مسٹر جناح سے مل کر ہندو مسلم اور مسلمانوں میں صلح کرانے لگے ہیں تو اس سے بڑھکر کم از کم ہندوستان میں تو کوئی اور پاگل نہ ہوگا۔ کیونکہ اب کانگریس اور مہاسبھا پر "بڑے باپو" کا جادو چل چکا۔ اجی بندہ پرور! جو گاؤ رکھشا کی خاطر مسلمانوں کی جان رکھشا ضروری نہیں سمجھتا ؎

ہم کو ان سے صلح کی ہے اُمید جو نہیں جانتے صلح کیا ہے!

لیکن خیر! ہمیں اس قسم کی بیکار باتوں سے کیا واسطہ۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ گم ہوا کیا؟
یہ تو ہونے سے رہا کہ کسی کا معشوق گم ہو جائے اور وہ اسے زنانہ مدارس میں ڈھونڈتا پھرے
ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ دن کے بارہ بجتے ہی کسی سورما کی عقل گم ہو جائے یعنی "مت ماری جائے"
اور وہ ہمسایوں سے صلح اور آشتی سے رہنے کی بجائے خون کی ندیاں بہانے کی دھمکیاں دینے
لگے۔ اور کچھ لوگ تو اسے پاگل سمجھ کر مسکرا دیں اور کچھ عقل کے اندھے اسے اپنی آنکھ کا "تارہ"
بنائے پھریں خواہ اس تارے کی کرامت سے اِن کی آنکھوں اور دِل میں تیرگی ہی کیوں
نہ پھیل جائے۔ ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریڈیو پر تقریر کرنیکی خاطر کسی کی خودداری
اس طرح گم ہو جائے۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ اور وہ قسمت کا مارا بھارت ماتا کی
دہائی دے کر یہ کہے کہ ریڈیو پر تقریر کرنا میرا پیدائشی حق ہے اور اگر مجھے ریڈیو پر تقریر
کرنیکا موقع نہ ملا تو پھر ہندوؤں کا کیا بنے گا۔ لیکن ریڈیو والے اپنے اصول یعنی با دوستان
تلطف با دیگراں کنارا پر اس طرح جمے ہیں۔ جیسے آجکل ہندوستان میں دھوتی پوش
وزارتوں پر جمے بیٹھے ہیں۔ اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے نفاق اور اختلافات
کی بدولت من مانی خوشیاں منا رہے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ آخر وہ بھی انسان
ہیں اور انسان بھی وہ جو فطرتاً جاہ پسند واقع ہوا ہے اور اگر کوئی ہم سے اس افلاطونی
دعوے کی دلیل مانگے تو اسے صرف اٹک کے اس پار والوں کی طرف دیکھ لینا چاہیئے یعنی
وہی غیور پٹھان جو گائے تو رہی ایک طرف کبھی بیل کے "سری پائے" ہضم کر کے ڈکار لیا کرتا

تھا آج سوٹ پینٹ کی "خانی" پر لات مار کر "سری بت" کہلانے پر مرا جا رہا ہے اور لنگی اور شلوار کی عظمت کھدر کی بجلول نما ٹوپی اور دھوتی پر قربان کر رہا ہے۔

حکیم مشرق حضرت علامہ اقبال کیا خوب فرما گئے ہیں کہ ؂

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو ۔۔۔ سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو؟

اس کا حال اب اللہ ہی جانے۔ ہم فیشن پرستوں کو کیا معلوم۔

تو باعث تحریر آنکہ اصل مطلب کی بات تو صرف یہ ہے کہ پھر گم آخر کیا ہوا؟ بات تو بالکل معمولی تھی لیکن روشنیٔ طبع جب بر من بلا ہو جائے تو پھر زبان قلم سے جو کچھ بھی نکل جائے وہ بقول ہمارے ایک نہ دیرینہ نہ تو یہ دیرینہ مہربان جو کسی کی سنتے تو ہیں نہیں لیکن اپنی ہی ہانکے جاتے ہیں۔ دل آزاری کا باعث ہو جاتا ہے۔ اور پھر دل آزاری بھی ایک سیّد کی ارے معاذ اللہ! تو ان کا ارشاد ہے کہ مرزا جی لکھنے کا کفارہ ادا کرو اور جہاں جہاں سے یہ کتاب ملے لیکر جلا دو کیونکہ اس کتاب سے جو شہرت مصنّف کو حاصل ہوئی ہے

اس کے خیال سے ہی ہم کباب سیخ بن رہے ہیں اور ع

جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں!

ہاں! ممکن ہے کہ کوئی صاحب علم و فضل اسکے مطالب اور معنی سمجھنے سے قاصر رہ جائیں تو انکی خاطر ہم تشریح کے طور پر صرف اس قدر عرض کرینگے کہ "آئے دن" "مرزا جی"

کے خلاف مضامین لکھ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑے جا رہے ہیں۔ تو خبر! پھر ہمیں تنبیہہ کیجاتی ہے کہ اگر تم نے ہمارے کہے پر عمل نہ کیا۔ تو یاد رکھو جب ہندی ہندوستانیوں کو سوا راج ملا تو سب سے پہلے تمہیں بن باس کا حکم ملیگا۔ کیونکہ مرزا جی کی زبان سے ہم نے خالص سچی سچی باتیں عرض کی ہیں اور سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے اور ہندو راج میں یہ سمجھ لینا کہ سانچ کو آنچ نہیں وہی پانی کا کوئیں کی تہ میں "تارا" ہو جاتا ہے اور تارہ ہے۔ بروزن استعارہ اور استعارہ کہتے ہیں اشارہ کو لیکن وہ عاشق کا اشارہ نہیں کہ ع،

کیوں ہم نے لیا دل ا

اور خیر! اب ع

ہم تم سے کہیں کیا؟

لیکن اگر چپ شاہ بن جائیں تو پھر گویائی گریباں گیر ہوتی ہے۔ اس لئے مجبوراً عرض کئے دیتے ہیں کہ ہم ڈرپوک نہیں۔ اور ڈرپوک ہو بھی کیسے سکتے ہیں آخر "ماس" کھانے والے ہیں اور پھر خدا کے فضل و کرم سے کانگرسی بھی نہیں کیونکہ "پس پردہ چوٹ کرنا" کانگرسیوں کا شیوہ ہے۔ ہاں! جو خود چوٹ کرے وہ اگر

ع:۔ کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ ؟

کار دنیا با سو دوستوں کے پاس نے بیٹھے۔ تو فرمایئے اس میں ہمارا کیا قصور؟ اقصور

ضلع لاہور نہ کہیں سمجھ لیجئے گا) —— رہا ہمارے خلاف مضامین لکھنا تو بسم اللہ

ع سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!!

ہاں! اب رہی وہ راز کی بات کہ گم ہوا کیا؟ تو اگر آپ حلف اٹھائیں کہ کسی غیر محرم سے آپ اس کا ذکر نہیں کریں گے تو بتلائے دیتے ہیں۔ سنئے! "مضامین اسلم" جب پریس میں چھپنے کے لئے گئے تو وہاں سے ایک کاپی کے پانچ سات اوراق اس طرح گم ہو گئے جیسے گورو مہاراج کی کرپا سے شہید گنج کا نام سنتے ہی بڑے بڑے "گرمکھوں کے اوسان گم ہو جاتے ہیں۔ اور شہر میں نقص امن کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر کتاب چھپ جانے کے بعد یہ راز فاش ہوتا تو ممکن تھا۔ کہ پڑھنے والے ایسے چکر میں پھنستے کہ بس ؎

اُڑ جائیں گے دھوئیں اک آن میں اس چرخ گرداں کے
اگر چکر دھوئیں نے دل کے زیر آسماں باندھا

لیکن خدا بھلا کرے جناب شوق صاحب کا۔ کہ انہوں نے شیرازہ بندی سے پہلے نہایت حکیمانہ طور پر مضامین کی پڑتال کر لی۔ اس طرح خریداروں کے سر سے آئی بلا تو ٹل گئی لیکن بیگار میں پکڑے گئے ہم۔ لیجئے! یہ ہے اس مضمون کی شان نزول

پنجاب کے ادیبِ شہیر ایم۔ اسلم کے چالیس فسانوں کا مجموعہ

کارزارِ حیات

جو علم دوست اصحاب۔ ایم اسلم کی طرزِ تحریر سے واقف ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں۔ کہ ایم۔ اسلم کو فطرت کی طرف سے کیسا دل و دماغ عطا ہؤا ہے اور آپ کے جذبات کس قدر پرکیف اور جدت نوازہوتے ہیں۔

لہٰذا کارزارِ حیات آپ کے ۴۰ دلکش پراثر افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا ایک ایک حرف نیزہ ونشتر ہر سطر مسرت خیز ہر صفحہ حیرت انگیز ہے اور ہر افسانہ ایک مرقع ہے۔

حجم تقریباً ۶۰۰ صفحات۔ گلیز کاغذ۔ خوشخط کتابت صاف چھپائی۔ خوبصورت جلد بندی کے باوجود

قیمت صرف۔ عــہ

مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرماویں۔

پتہ

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب کشمیری بازار بل روڈ لاہور

پنجاب کے مشہور انشاپرداز ایم اسلم کے چالیس افسانوں کا مجموعہ

تفسیرِ حیات

جن اصحاب نے ایم اسلم کے افسانے پڑھے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ زندگی کے
وہ معمولی معمولی واقعات جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے ایم اسلم
صاحب اسمیں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں ر
سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایم اسلم ایک معمولی واقعہ سے متاثر ہو
ایسا رومان خیز افسانہ لکھتے ہیں۔ کہ سو بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اس
آپ کی طرزِ تحریر اس قدر دلکش اور اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ ہر افسانہ مکمل ڈرا
معلوم ہوتا ہے۔

تفسیرِ حیات کا حجم تقریباً سوا سات سو صفحات ہے۔ نہایت خوشنما
کاغذ گلیز۔ کتابت خوشخط۔ چھپائی صاف خوبصورت جلد بندی کے باوجود

قیمت عہ — مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرماویں

پتہ

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب کشمیری بازار بل روڈ لا